[illegible]

[illegible]

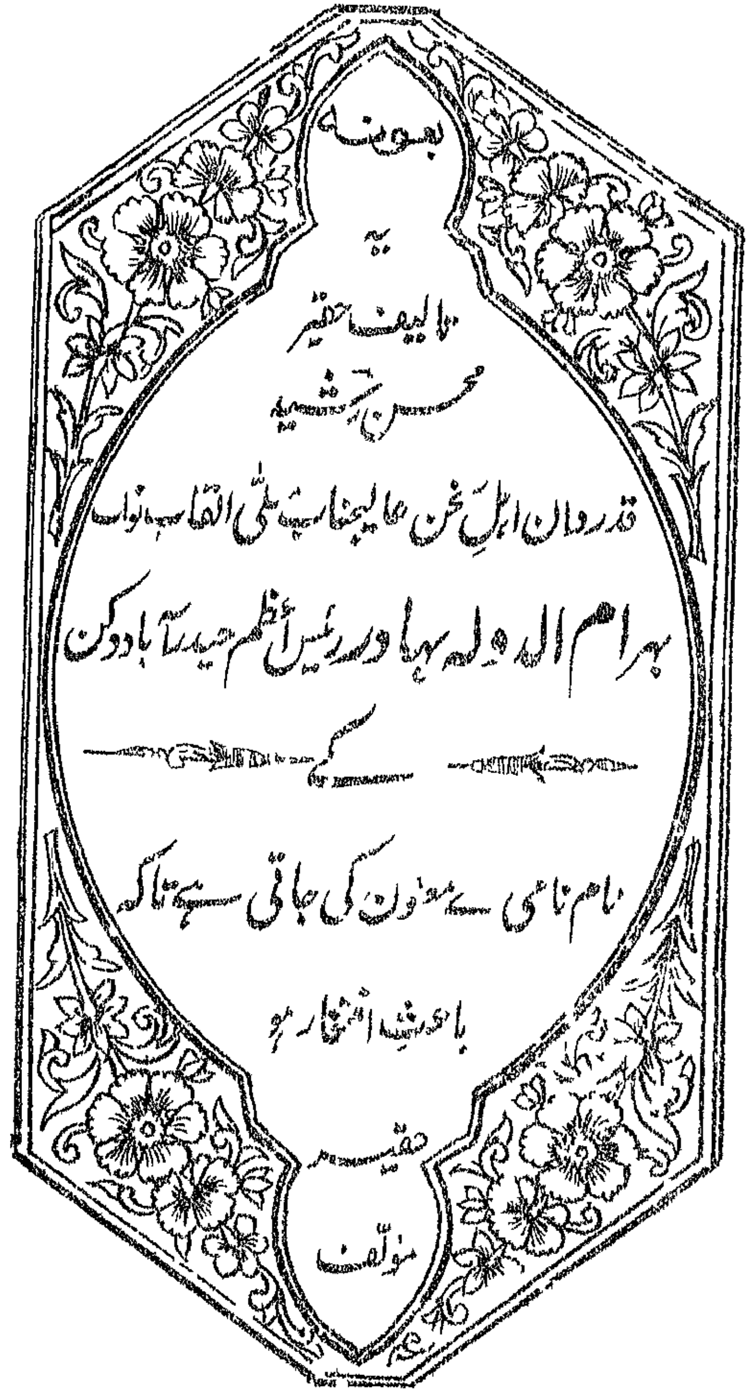
انتخاب مراثی و رباعیات و قصائد و سلام و غزل وغیرہ

مولفہ

سید آغا اشہر لکھنوی

اصح المطابع [illegible] لکھنؤ

[illegible]



بعونہ

یہ

تالیف مختصر

محسن تحشیہ

قدردان اہلِ سخن عالیجناب معلّی القاب نواب

بہرام الدولہ بہادر رئیس اعظم حیدرآباد دکن

کے

نام نامی سے معنون کی جاتی ہے تاکہ

باعث افتخار ہو

حقیر

مؤلف



عرض مؤلف

کسی فردِ کامل کے واقعاتِ زندگی کو جمع کرکے عوام کے سامنے پیش کرنا میری رائے میں ایک اجر معقول رکھتا ہے جس کا معاوضہ اگر غور سے دیکھا جائے تو ناممکن ہے یہ ایک ایسا احسان ہے جو اُس اہلِ فن پر ہوتا ہے جس سے اُس فرد کو تعلق ہو۔ مثلاً اگر کسی فاضل کے حالاتِ زندگی لکھے جائیں تو پڑھنے والے کو جابجا عجیب باتیں علم و فضل کے متعلق ملیں گی۔ اُس وقت کے فلسفہ۔ منطق۔ ریاضی۔ ادب فقہ وغیرہ کے بہتر سے بہتر جاننے والے اُس ایک فرد کی وجہ سے جستہ جستہ ابواب میں نمایاں نظر آئیں گے۔ اُس خاص دور کے لوگوں کا کسی خاص صنفِ علم کی طرف انہماک کا اظہار ہو جائے گا۔ اُس صنف کی تصنیفات و تالیفات کے متعلق پڑھنے والے کو اطلاع ہو جائے گی۔ حاکمِ وقت کی روشِ حکومت۔ اور اُس کے زمانہ میں جو کوششیں علوم و فنون کے برقرار رکھنے میں کی گئی ہونگی معلوم ہو جائیں گی اور پڑھنے والے سے داد طلب ہونگی

المختصر اگر کسی مقتدر فرد کے حالاتِ زندگی اچھی طرح مرتب ہو جائیں تو پڑھنے والے

اُس کے عادات و اطوار و اخلاق و علم کا اثر ضرور پڑے گا۔ اور بعض اُس کی پیروی کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ معلوم ہوا کہ اس قسم کی سوانح عمریاں آئندہ نسلوں کے لیے ایک قسم کی درسی کتابیں ہیں۔ خصوصاً کسی زبان کے زبردست ادیب کے حالاتِ زندگی از اول تا آخر خود ادب ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ ہر شخص کو اپنے علم ادب سے جس قدر دلچسپی ہوتی ہے اتنی اُس کے غیر سے ہرگز نہیں ہوتی۔ اس علم ادب میں وہ تمام باتیں مجموعۃً ملتی ہیں جو علیحدہ علیحدہ علوم میں نظر آتی ہیں۔

یورپ آج کل زبان زبان پکار رہا ہے۔ اشاعتوں کی کوئی انتہا نہیں۔ دُنیا کے چاروں کونے مغربی زبان کی تصنیفات و تالیفات سے مالا مال نظر آتے ہیں۔ انسانی تمدنیات میں اصلاحات کے پردہ میں تغیر و تبدل ہو رہا ہے۔ روش سلطنت اور ہی رُخ جاتی ہے۔ خود ہمارے ہندوستان میں انگریزی علم ادب کو اس قدر توسیع ہوئی ہے کہ اُس کے اصولوں سے بیشتر نام وہ لوگ بھی جانتے ہیں جو اس زبان سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ انگلینڈ کا کیا ذکر ہندوستان کا ہر پڑھا لکھا آدمی میر، غالب، انیس کو ہرگز نہیں جانتا۔ مگر انگلینڈ میں پیدا ہونے والا ہومر، شیکسپیئر، ملٹن کو ضرور جانتا ہے اور فخر کرتا ہے کہ اس کی قوم میں ایسے جوہرِ قابل پیدا ہوئے ہیں۔

کاش ہم کو بھی زمانہ فرصت دے اور اس قابل بنائے کہ ہم بھی اپنی ملکی زبان کے برقرار رکھنے میں ہم آواز ہوں۔

شاعری اور مرثیہ

زمانۂ خلیق تک فن مرثیہ گوئی محدود تھا۔ خلیق نے اس پر کچھ اضافہ کر کے آگے بڑھایا۔ انیس و دبیر ایسے کامل افراد نے اس آلۂ ترقی کو اس قدر توسیع دی کہ اگر آنے والی نسلیں اس کا صحیح استعمال بے کم و کاست کرتی رہیں تو سعی کوششیں

ترقی اُردو کی ایک طرف ساد، مرثیہ گوئی ایک طرف جب مجموعہ کیجیے کا اس شعبۂ سخن کو مطالعہ کیا
اس سے قطع نظر کر کے کہ عام اہل اسلام کے لیے عموماً اور شیعوں کے لیے خصوصاً
مرثیہ کا ایک حصہ (اصل واقعات کربلا) مذہبی دلچسپی رکھتا ہے۔ مگر اس کے علاوہ اُس کے
دوسرے اجزا مثلاً بیانِ شجاعت، بیانِ عفت، بیانِ سخاوت، بیانِ عدالت
یا وہ اوصاف جو ان کے تحت میں آتے ہیں، مثلاً ایثارِ نفس، صبر وغیرہ عالمِ انسانیت
کے لیے متحد ہیں اور سب کے جذبات بلا اضطرار اس سے دائمی تعلق رکھتے ہیں لہذا دُنیا کے
ہر مذہب کے افراد کے لیے مرثیہ میں یکساں دلچسپی کے سامان موجود ہیں۔

یہی سب باتیں تھیں جنھوں نے مجھ کو رشید کے حالاتِ زندگی لکھنے پر آمادہ
کیا کہ آخر میں نے اُسے ختم ہی کر کے چھوڑا۔ الحمد للہ والمنہ۔

دُنیا میں یوں تو ہر شخص تعلقات اور مجبوریوں کا بندہ ہے۔ دوسرے انسان کو زمانہ
کسی خاص مصروفیت کے لیے بہت کم وقت دیتا ہے۔ لیکن باوجود اس کے اگر کوئی خوش مذاق
طالب علم جس کو کتاب سے دائمی تعلق ہو گیا ہو، اپنے مصروف اوقات کا کچھ حصہ ادبی خدمت
میں صرف کرے تو اُس کی زندگی کے وہ لمحے دلچسپی کی نظر سے دیکھے جانے کے قابل ہیں۔

جناب رشید مرحوم مجھ پر بہت عنایت فرماتے تھے اور مجھ کو بھی ان سے ایک
خاص اُنس تھا۔ ایک مرتبہ غالباً ۱۹۱۶ع میں میں نے عرض کی "آپ اپنے کچھ حالات
قلمبند کرا دیجیے، تاکہ آپ کے بعد اُردو بولنے والوں کے سامنے پیش کر کے اُن کو آپ کی
ادبی خدمتوں کا معترف کیا جائے" جواب ملا "کیا ضرورت ہے"۔ دوسری مرتبہ میں نے
اس کا ذکر جناب سید باقر صاحب حجّت مرحوم سے کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ جناب
مولوی سید محمد تقی صاحب شادماں لکھنوی ... مدرسہ عالیہ ... لے گئے

خود جناب رشید سے ان کے حالات قلمبند کیے ہیں اور کچھ مرتب بھی کر چکے ہیں۔"
اب مجھ کو اس کے متعلق مزید سوال کی گنجائش نہ رہی۔ بلکہ یہ سن کر مسرت ہوئی کہ رشید کے
حالات ایک سنجیدہ قلم سے شائع ہو گئے۔

جناب رشید کے انتقال کے بعد ایک روز پھر میں نے جناب حمید مرحوم
سے عرض کی "ابھی تک کوئی تالیف رشید کے متعلق شائع نہیں ہوئی" مرحوم نے
فرمایا "نا امید ہی" میں نے عرض کی "اگر میں کوشش کروں تو آپ مدد دیجیے" فرمایا "
بسر و چشم لیکن اگر مولوی محمد تقی صاحب شاداں سے وہ مکمل حالات مل سکیں
جو انھوں نے اس غرض سے فراہم کیے ہیں تو زیادہ بہتر ہوگا" میں نے کہا۔ "بہت خوب"
چنانچہ ۱۹۱۶ء میں صرف اس غرض سے میں رامپور گیا اور مولوی صاحب موصوف سے
خواہش کی کہ وہ مجھے حالات جناب رشید دے دیں۔ انھوں نے مجھ کو اپنا نیاز مند
قائم رکھ کے وہ تمام ذخیرہ جو ان کے پاس موجود تھا میرے حوالے کیا۔ جو اس تالیف کے
مندرجہ ذیل حصوں پر کافی روشنی ڈالتا ہے

(۱) جناب انس کے حالات قریب قریب مرتب

(۲) رشید کے حالات غیر مرتب (یعنی صرف ان کے مرثیہ پڑھنے کے مقامات کا مختصر حال)

باقی تمام حالات ضروری بڑی کوشش سے خود فراہم کیے جو اس ترتیبی صورت میں اوراق
ناظرین کے سامنے پیش ہیں۔

جناب رشید کے حالات زندگی اس سے زیادہ ہو بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ مرحوم
نے اپنی تمام عمر گوشۂ عافیت میں گذار دی۔ دوسرے مرثیہ گوئی کا اہم کام ان کے دن
ایسا تھا کہ ان کو کنج عزلت سے نکلنے سے روکتا تھا

میں جناب مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی اور جناب مرزا کاظم حسین صاحب محشر کا ممنون ہوں۔ ان دونوں حضرات نے مجھ کو مختلف واقعات رشید دیے۔ اور وقتاً فوقتاً میری ہمت افزائی کرتے رہے تاکہ میں جلد سے جلد اس تالیف کو ختم کروں۔ جناب نواب مجن صاحب جویا۔ اور جناب بدھن صاحب فرہاد لکھنوی کا ممنون ہوں ان حضرات نے مجھ کو فراہمی کلام رشید میں مدد دی ہے۔ جناب مولوی سید محمد حسن صاحب ہاتف وکیل۔ اور جناب منشی علی محمد صاحب نظم سیتاپوری کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں اول الذکر کے مسودہ ہائے صاحب سے مستفید ہوا ہوں اور آخر الذکر کے ذخیرہ کتب سے اکثر مدد ملی ہے۔ آخر میں مخلصی جناب سید اولاد حسین صاحب شاداں بلگرامی پروفیسر مدرسہ عالیہ ریاست رامپور کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ موصوف نے اس مسودہ کوشش کے میری ہمت افزائی کی ہے۔ اور بیش بہا مشورے دیے ہیں۔

ناظرین کی خدمت میں ایک مختصر عرض اور کرنا چاہتا ہوں۔ اور عبارت کو ختم کرتا ہوں وہ یہ کہ علاوہ اصل واقعات کے اگر کوئی رائے غیر مناسب ہو۔ یا کوئی بحث کسی صاحب کو پسند نہ آئے تو وہ میرے قلم کی کوتاہی ہے جس کا میں ہر وقت معترف ہوں اور رہوں گا۔

احقر
سید آغا اشہر لکھنوی

اس بنا پر باطنی نظّارہ کرنے والا کبھی مطمئن نہیں ہو سکتا کیونکہ اُس کا اشتیاق اپنے مطمحِ نظر صورت کی تلاش میں کوئی مستقل حد قائم نہیں کر سکتا بلکہ ہر لحظہ بڑھتا ہی جاتا ہی۔ ہاں اگر خیال اور اضطرار کی کوئی حد معین ہوتی تو میں ہرگز یہ نہیں کہہ سکتا کہ تصویرِ قلم سے زیادہ تصویرِ خیال دلچسپ ہی۔

یہ مسلّم ہی کہ شاعری اور مصوّری ایک ہی درخت (خیال) کی دو بار آور شاخیں ہیں لیکن شاخِ مصوّری شاعری کی گھنی شاخ کے سایہ میں جھونکے لے کے دلفریبیاں دکھاتی ہی کیونکہ مصوّر بھی پہلے شاعرانہ قوّت سے کام لیتا ہی اُس کے بعد اندازہ سے اور پھر قلم سے اس وقت آپ کے سامنے میں نے دو تصویریں پیش کیں۔

۱۔ تصویرِ قلم ۲۔ تصویرِ خیال

تصویرِ قلم کی تکمیل کے لیے ان چیزوں کی سخت ضرورت ہی۔

۱۔ مصوّر کا صحیح اندازہ۔ ۲۔ حسبِ منشا قلم پر قدرت۔

۳۔ مناسبتِ اجزائے تصویر۔ ۴۔ سامان۔ رنگ وغیرہ۔

وہی قلم کار کامیاب سمجھا جاتا ہی جس کو یہ سب آسانیاں نصیب ہوں۔ اُسی خوش قسمت کے بنائے ہوئے نمونے اس نظر فریب تجارت کے بازار کو گرم رکھتے ہیں۔ گو اُس سے کم مرتبہ والے بھی ہمیشہ شہرت کے زینہ پر اس کے برابر آنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن جہاں فطرت کا دخل ہوتا ہی وہاں کوشش و کسب بے سود۔

افسوس ہی کہ اس فن کی قدر ہندوستان میں ابھی بالکل نہیں ورنہ اس کی ترقی کے ساتھ شاعرانہ ترقی بھی جاری رہتی۔

اسی طرح ایک تصویرِ خیالی کے لیے مندرجہ ذیل چیزوں کی ضرورت ہی۔ جن کا مکمل

علیحدہ علیحدہ ایک دوسرے کی تکمیل کرتا ہے۔ یعنی

۱۔ صحتِ خیال ۲۔ قدرتِ اظہار

۳۔ مناسبتِ الفاظ ۴۔ اطلاعِ فن

یہ سب خوبیاں اگر کسی شاعر میں پائی جائیں تو بے شک وہ ایک فطرتی شاعر ہے۔ مگر تجربہ بتاتا ہے کہ اس معدوم ہو جانے والے گروہ کے آخری دور تک ایسے کاملین کے کم نام جمع ہو سکیں گے۔

صحتِ خیال | یہی صحتِ خیال بعض اوقات شاعر کو ان امور کا پتہ دیتی ہے جو عالمِ وجود میں ابھی نہ آئے ہوں۔ یہی قوت شاعر اور پیشین گو کو ایک ہی درجہ پر لے آتی ہے۔ شاعر کا ذریعۂ اطلاع اس کا ذہنِ رسا اور فکرِ رسا ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے ایک پیشین گو کا ذریعۂ اطلاع اس کا تزکیۂ نفس اور معانیٔ باطن ہوتی ہے۔ اور دونوں میں یہی فرق ہے جس کی وجہ سے ایک ایسے شاعر کو جو قوتِ استنباط رکھتا ہو دنیا دوسری نظر سے دیکھتی ہے۔ اور ایک پیشین گو کو دوسری نظر سے۔ اس موقع پر بے اختیار غالب کا یہ شعر یاد آگیا ؎

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

اگرچہ بظاہر ان دونوں کا پیرایۂ عمل ایک دوسرے سے جدا نظر آتا ہے مگر غرض دونوں کی خلق کی ایک ہی ہے۔ شاہ نعمت اللہ کے قصائد کی نسبت مشہور ہے کہ ان میں تمام آئندہ کے حالات بالاجمال لکھ دیے گئے ہیں۔ اب آپ کی پسند پر ہے انھیں پیشین گو کا لقب دیجیے یا شاعر کا۔

قوتِ اظہار | صحتِ خیال کے بعد قوتِ اظہار کی باری آتی ہے۔ یہ قوت بھی شاعر کے لیے ایسی ہی ضروری ہے جیسے مذکورۂ بالا قوت یعنی (صحتِ خیال)۔ اس کے بغیر شاعر کا کوئی خیال صحیح عالمِ وجود میں نہیں آ سکتا۔ اس کی تمام فکریں رائگاں، اس کے تمام منصوبے

سے شعر۔ اگر یہ قوت نہیں تو کچھ نہیں۔ لیکن جہاں یہ قوتیں برابر برابر کام کرتی ہیں وہاں خدا کی قدرت نظر آتی ہے۔ اور ان کا رکھنے والا جس نام سے پکارا جائے زیبا ہے۔

متقدمین شعرائے عجم میں فردوسی، اور متاخرین میں قاآنی ہے۔ اردو میں سودا اور انیس ہیں۔ جن میں قوت اظہار درجہ کمال پر پائی جاتی ہے۔ اگرچہ دوسرے نام بھی اسی سلسلہ میں لکھے جا سکتے ہیں مگر یہاں اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ مہر ناظر کو اختیار ہے کہ اپنی رائے کے موافق دوسرے نام بڑھا لے۔

مناسبت الفاظ | اظہار خیالات و جذبات کا قدرتی آلہ جو انسان کو فطرت کی طرف سے عطا ہوا ہے وہ اُس کی مادری زبان ہے۔ جس قدر ہم اپنی زبان کے اصطلاحات و محاورات پر قادر ہونگے اُسی قدر ہماری شاعرانہ خوبیوں کو اظہار کا موقع ملے گا۔ یا یوں کہنا درست ہوگا کہ جس کو جس قدر ملکہ اسی خزانہ کے صرف کرنے کا حاصل ہوگا۔ اُسی قدر اُس کی جولانی طبع جواہر نگار نظر آئے گی۔

اسی مناسبت الفاظ کو شاعر صنائع کا ہی کہتا ہے۔ اسی کو طبع کاری۔ یہی سخن طرازی ہے یہی دل آویزی۔ حالانکہ یہی سب کچھ ہے۔

اس قوت کے جوہر اُسی وقت کھلتے ہیں جب کسی مقرر کو یا کسی شاعر کو کسی مجمع کو مخاطب کرنا ہو۔ کسی مضمون کو مختلف رخوں سے بدلنا ہو یا اُن کے جذبات طرب یا جذبات الم کو برانگیختہ کرنا ہو۔ یا کسی واقعہ کو مسلسل بیان کرنا ہو تو بغیر مناسبت الفاظ سامعین خاطر خواہ متوجہ نہیں رہ سکتے۔ اسی طرح ایک مصنف یا مؤلف کو جب تک مناسب تحریر کی قدرت نہ ہو اُس وقت تک صرف کاغذ کا سیاہ کرنا ہے۔

ایک معنوی شاعر کی شناخت یہ ہے کہ اُس کی نظم میں خیالات و مناسبات الفاظ

وہ … یکساں نظر آتے ہیں۔ وہی شعر سہلِ ممتنع کہے جانے کے قابل ہے جس میں حسنِ خیال
کی خوبی اپنی حد تک پہنچ چکی ہو۔ اور مناسبتِ الفاظ کی کسوٹی پر کس لیا گیا ہو۔

یہی صفت شاعر کو پختہ کار بناتی ہے۔ یہی قادر الکلام کہلواتی ہے۔ یہی فردوسی کو فردوسی
قاآنی کو قاآنی سودا کو سودا اور انیس کو انیس منواتی ہے۔

کسی واقعہ یا مضمون کو نظم کر دینا کوئی مشکل امر نہیں مگر اس کو دلچسپ بنانا مشکل ہے
ہزاروں شاعر پیدا ہوتے ہیں مگر ایک صدی دوسری صدی کو جو شعرا کی فہرست دیتی ہے
اس میں مشکل سے چار یا پانچ نام ہوتے ہیں۔ اور بس۔

اس وقت اردو شاعری کا سفینہ کھینے والے ہندوستان میں ہر طرف نظر آتے ہیں
مگر زمانہ کی بے رخ لہر خود انہیں کو ادھر سے ادھر تھپیڑے دیتی ہے کہ سنبھلنا مشکل ہے ساحلِ
مراد پر پہنچنے کا کیا ذکر۔ بہرحال یہ بھی ایک قسم کا احسان ہے جس سے جس طرح بن پڑے کوشش
کیجیے کسی وقت تو کامیابی کی دیرینہ صورت نظر آئے گی۔

اطلاع فن | اطلاعِ فن کے متعلق یہ عرض ہے کہ سب سے پہلی ضروری چیز بھی یہ ہے اور
سب سے آخر بھی۔ اور نہیں بھی۔ مگر شاعر کو نہایت ضروری ہے کہ مشقِ سخن سے پہلے فنِ شعر
کے ابتدائی مسائل سے واقفیت حاصل کر لے ورنہ بغیر اس کے خود اس کی طبیعت کو اطمینان
کبھی نصیب نہیں ہو سکتا۔ ذوق و ناسخ کی طرح نہ سہی تو انیس و آتش ہی کی طرح سہی
گو چودھویں صدی کی شاعرانہ طوائف الملوکی نے فن کا سد باب کر دیا ہے مگر جو خال خال فرد
واقفِ فن اس وقت نظر آتے ہیں ان کے بعد اتنے بھی نہ ہوں گے۔

بس یہ تنگ میدانِ قلم جو لکھنا تھا لکھ چکا۔ اب یہ آخری صدا دے کے ختم کرتا ہے کہ
صدا ہے کہ نوجوانو! ہند کی خاک کو کیمیا بناؤ۔ اور اپنی مادری زبان کو سنوارو۔

احمد میرزا صابر

سید ذوالفقار علی میرزا

یہ بزرگ غالباً زمانہ محمد شاہ میں کشمیر سے دہلی آئے اور کسی وزیر کے نائب ہوئے اور خطاب میرزا حاصل کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی اولاد و احفاد کے نام کے ساتھ لفظ میرزا ضرور ہوتی ہے۔ بعد اس کے سید ذوالفقار علی میرزا دہلی سے لکھنؤ آئے اور یہاں آکر سکونت اختیار کی۔

لفظ میرزا کی تحقیق

اس لفظ کے متعلق جہاں تک تحقیق ہوئی اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ میرزا کا جزو نام ہونا علامت سیادت کی نہیں۔ اگرچہ ایران میں یہ لفظ اطلاق سیادت کرتی ہے۔ مگر ہندوستان میں اس خصوصیت کے لیے مروج نہیں چنانچہ صاحب بہار عجم لکھتے ہیں

"میرزا بیائے معروف مایں لفظ بیشتر از القاب بادشاہاں و شاہزادگان بود
دریں روزگار بر بزرگزادگان و رئیس پسراں اطلاق کنند۔ در ایران
بر سادات نیز مجوز است۔ غالباً میر مخفف امیر است پس معنی ترکیبی
میرزا، امیرزادہ باشد۔ از زمانے کہ نادرشاہ در ہندوستان در آمد
و دخل و تصرف آورد۔ اطلاق میرزایاں بر محرران دفتر شاہی کنند
کہ میرزائے دفتر عبارت از نویسندہ دفتر خانہ پادشاہی ست"

مولف کے نزدیک چونکہ میر اصطلاحاً بمعنی سردار ہے جیسے میر آتش، میر سامان، میر بخشی وغیرہ اسی طرح میرزا سے ملازمین دفتر شاہی کی ایک عظمت ظاہر ہوتی ہے۔

بہرحال سید ذوالفقار علی میرزا مع اپنے فرزند سید علی میرزا صاحب کے لکھنؤ آکر مقیم ہوئے۔ ان بزرگ نے دہلی کیوں ترک کی۔ اور لکھنؤ کیوں آئے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ زوال سلطنت مغلیہ کے ہمراہ اہل قلم کا ستارہ بھی پستی کی طرف مائل ہونے لگا زمانہ نے ایسے ایسے نازک مزاج اور مستغنی دلوں کو حوادث کا نشانہ بنایا جو کبھی سوائے آسمان کے

زمین کی طرف دیکھتے ہی نہ تھے۔ کونسی مثال دی جائے کس کا نام لکھا جائے۔ اُس وقت کے ناموروں کے تذکروں کا ہر ہر ورق ایک نئی مثال پیش کرنے کو تیار ہے بہت ٹھیک خیال ہے کہ دہلی اُجڑی۔ اور لکھنؤ آباد ہوا۔

امرائے لکھنؤ کی اولوالعزمیاں حد اعتدال سے متجاوز ہو چکی تھیں۔ دہلی کے ضعف کا کوئی خاص اثر لکھنؤ پر نہ تھا۔ علوم قدیمہ کا وقار دلوں میں باقی تھا۔ خصوصاً فن شعر کا عالمگیر اثر اس ناداری کے زمانہ میں بھی بہت سے دلوں پر قادر رہا۔ اُس وقت کے رؤسا کے درباروں کا ایک گلدستۂ زینت تھا۔ جس نے دہلی کو الوداع کہا وہ لکھنؤ یا حیدرآباد جا بسا +

افسوس ہے کہ میر صاحب کے مزید حالات نہ مل سکے۔ جو درج کیے جاتے خود جناب رشید مرحوم سے جیسا معلوم ہو سکا تھا۔ وہ لکھا گیا۔ کیونکہ کسی تاریخ کی کتاب میں اُن کے خاندان اور کسب معاش کے متعلق کچھ نہ ملا + البتہ آغا میر کا ذکر ملتا ہے۔ صاحب تاریخ اودھ عبارت ذیل لکھتے ہیں جس سے عالی نسبی اور سیادت کی شہادت ملتی ہے

"از اں جملہ نواب معتمد الدولہ آغا میر کی علوئے نسب پدری و شرافت وسیادت۔ و حسن لیاقت اور مروت خاص۔ اور رسیر چشمی و رفقا پروری بہت غنیمت تھی"

(معتمد الدولہ آغا میر سید ذوالفقار علی کے بھتیجے تھے)

سیّد علی میرزا

یہ ذوالفقار علی میرزا کے فرزند تھے۔ شاہِ اودھ (غازی الدین حیدر) کے زمانہ میں کارِ سفارت انجام دیتے تھے۔ بنارس میں ان کا زیادہ قیام رہتا تھا۔ نہایت خوب صورت اور وجیہ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جب بنارس میں نکلتے تھے تو لوگ اُن کی صورت دیکھ کر درود پڑھتے تھے۔ لکھنؤ میں جس قدر منڈیاں تھیں۔ اُن کی تحصیل وصول بھی انھیں کے متعلق تھی۔ معتمد الدولہ آغا میر مشہور وزیرِ اودھ ان کے چچا زاد بھائی تھے۔ بھائیوں میں چشمک رہتی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب آغا میر کو عروجِ تام حاصل ہوا۔ ان کی تنخواہ بند کرا دی۔ شاہ مینا صاحب کے وہاں ایک محلہ میں رہتے تھے۔ تخمیناً ستر برس کی عمر ہوئی اور غالباً حسن رضا خاں کے امام باڑہ میں مدفون ہیں۔

سید صاحب کے دو بیٹے تھے۔ سید محمد میرزا اُنس۔ سید محمد رضا قدس۔

علی میرزا صاحب مغفور کو خطِ نسخ میں یدِ طولےٰ حاصل تھا۔ اور اُس وقت کے بہتر نسخ لکھنے والوں میں شمار ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ پورا سورۂ یٰس لکھ کر حضورِ شاہی میں پیش کیا تھا۔ جس کا خاطر خواہ صلہ ملا۔ رشید مرحوم کے پاس ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا پورا قرآن شریف موجود تھا +

سید محمد میرزا صاحب اُنس

سید ذوالفقار علی کے پوتے اور جناب رشید کے دادا تھے۔ ان کا تخلص (اُنس) تھا۔ حضرت ناسخ مرحوم کے شاگرد تھے۔ اس خاندان میں انھیں سے شاعری کی ابتدا ہوتی ہے۔ تعجب یہ ہے کہ تذکرۂ آبِ حیات میں آزاد مرحوم نے شیخ ناسخ کے نامی شاگردوں کی فہرست میں ان کا نام نہیں لکھا۔ ظاہرا وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اُن کا دیوان شائع نہیں ہوا۔ دوسرے آزاد مرحوم نے شاگردانِ ناسخ کے لیے زیادہ کاوش بھی نہیں کی ہے۔ البتہ عبدالغفور خاں شہباز نے اپنے تذکرہ میں سلسلۂ ناسخ میں اُنس کا ذکر کیا ہے۔

جنابِ اُنس ذی علم بزرگ تھے۔ عربی کے تمام درسیات نکلے ہوئے تھے۔ اور فارسی میں بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ شعر بھی اچھا کہتے تھے۔ دیوان قلمی اس وقت تک خاندانِ رشید میں موجود ہے۔ جنابِ رشید سے جب کہا گیا "وہ دیوان طبع کرا دیجیے"۔ فرمایا: "اُن کی وصیت تھی کہ چھپوانا نہیں"۔

حلیہ ولباس | گورا رنگ تھا۔ نہایت خوب صورت تھے۔ جوانی میں ورزش کا بہت شوق تھا۔ کیا وہ (جو مثل کمان کے ہوتا ہے) کھینچتے تھے۔ اونچی چوٹی کا انگرکھا پہنتے تھے۔ اور جس وقت دربار میں جاتے تھے تو چپکن استعمال کرتے تھے۔ کرتہ گھٹنے نیچا ہوتا تھا۔ کبھی مشروع کا پاجامہ پہنتے تھے۔ اور کبھی سادہ۔ ٹوپی پنجگوشیہ قالب دار۔ جوتہ گھیتلا وہی ایک اشرفی کا۔ مگر کبھی کبھی لوٹ بھی +

بُڑی سکونت | شاہی زمانہ میں بہت سے محلوں میں رہے مثلاً منک گنج، شیدیوں والا احاطہ غدر کے بعد حسن خاں خواص واجد علی شاہ کا مکان ایک ہزار ایک سو روپیہ کو خرید کیا

اُس کے برابر ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا وہ بھی خریدا۔ اس میں متعدد چھوٹے چھوٹے مکان بنوا کر بنائے جو اب تک "میر عشق کی بقیہ" کے نام سے موسوم ہیں۔ مگر میر صاحب کے زمانہ میں وہ باغِ اُنس کہلاتا تھا +

میر صاحب نے چاہا تھا کہ اس باغ کے متصل ایک امام باڑہ بنائیں لیکن آپ کا اٹھنا تھا اور اُس کے ادھورے در و دیوار بن کر رہ گئے۔ جو اب تک موجود ہیں۔ اس امام باڑہ کے مقدس تہ خانہ میں سبزہ زارِ نظم کے چند ہزار بیان بلبل خوابِ گراں میں مصروف ہیں۔ اب وہ وقت ہے کہ خود اُنکے ہاتھوں کے پرورش یافتہ درختوں کے پھول نسیم سحر کو اپنی مہک سے عطر بیز کرتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ کبھی پھر ہماری طرف توجہ کریں۔ مگر وہ سرد جھونکے اُن کے خواب کی مدت اور طولانی کرتے ہیں اور یہ شعر پڑھتے ہوئے واپس آتے ہیں

یہ سناٹا یہ تاریکی یہ گورستاں یہ ویرانی تمہیں اے سونے والو کس طرح آرام آتا ہے

یہاں اُنس، صابر، تعشق، عاشق، حدید کی قبریں ہیں۔ (میر عشق کی قبر یہاں نہیں ہے بلکہ اُس مکان میں ہے جہاں رشید مرحوم رہتے تھے۔ وہ مکان بھی باغ سے متصل ہے) +

اُنس اور شاعری

اُن کی غزل خوانی کا بہت شہرہ تھا۔ سراج الدولہ، اسیر وغیرہم کے مشاعروں میں اکثر شریک ہوتے تھے۔ اور مشاعرے کو اپنا شاعر ان سنا کے اُٹھتے تھے۔ آخر وقت میں جب نواب مہدی حسن خاں عرف آغا ابو صاحب سی۔ آئی۔ ای متولی حسین آباد مبارک کا شباب تھا۔ تو اُن کو بھی بہ تقاضائے عمر شعر گوئی کا شوق ہوا۔ کئی دفعہ خود اُنس مغفور کے پاس آئے۔ اور اپنے مشاعرے کی شرکت کی استدعا کی۔ میر صاحب نے پیرانہ سالی کا عُذر کیا۔ مگر آغا صاحب اس قدر حُسنِ عقیدت رکھتے تھے کہ نہ مانا۔ مجبوراً میر صاحب چند مشاعروں میں شریک ہوئے +

اتوار کی صحبت

میر صاحب کے یہاں ہر اتوار کو ایک صحبت ہوا کرتی تھی۔ شہر کے اکثر نامی شعراء اور رؤسا اور اہل علم آیا کرتے تھے مثلاً سلیق - تجمل - میر میر کاظم عرش مجدومی نثار حسین صاحب کے والد مولانا فضل علی صاحب مرحوم تعشق عشق - صابر - اچھے صاحب عتیق ان لوگوں سے تو گویا اتوار خالی ہی نہ ہوتا تھا۔ حکیم شفاء الدولہ مرحوم کے بھائی میاں فلک مرحوم صرف شرکت صحبت کی غرض سے لکھنؤ اکثر آیا کرتے تھے (اللہ اکبر ایک وہ زمانہ تھا اور ایک ہمارا زمانہ ہے کہ شعر و سخن کے دلدادہ گویا کہ اس وقت کے مقابلہ میں بالکل نہیں ہوتے) چائے بسکٹ - شامی کباب - روغنی روٹیاں - تواضع میں پیش کی جاتی تھیں۔

اس صحبت میں ہر قسم کے ذکر اذکار ہوتے تھے کبھی شاہی زمانہ کے قصے چھڑ گئے کبھی شاعری پر بحث ہونے لگی۔ کبھی لغوی تحقیقات ہونے لگی۔ اور کبھی شعر خوانی۔

جناب رشید ہمیشہ فرماتے تھے کہ دادا صاحب (جناب انس) شیخ ناسخ کا ذکر اکثر کیا کرتے تھے اور عجیب عجیب و دلچسپ حکایات بیان کرتے تھے۔ مثلاً۔

نقل

ایک مرتبہ شیخ صاحب کی خدمت میں غزل لے کر ٹکسال والے مکان میں حاضر ہوا۔ جیسے ہی دروازہ میں قدم رکھا دیکھتا کیا ہوں کہ موری بند کرا دی ہے تمام انگنائی میں پانی بھرا ہوا ہے۔ اور بیچ صحن میں خود بدولت چوکی بچھائے بیٹھے ہیں مجھے ہنسی آگئی لیکن ان کے خوف سے فوراً ضبط کیا۔ جب میری طرف دیکھا میں نے سلام کیا۔ کہا آؤ۔ آج اس فرمانے پر قریب تھا کہ میں بے اختیار ہنس پڑوں۔ لیکن بمشکل ضبط کر کے عرض کیا۔ کہ حضور کیونکر آؤں۔ چاروں طرف تو پانی

بھرا ہوا ہے۔ فرمایا ہاں۔ پھر آدمی کو پکارا صلابت! صلابت! وہ آیا تو اُس سے کہا پٹرا لاؤ وہ ایک لمبا سا پٹرا لایا وہ رکھا گیا۔ اور میں اُس کے ذریعہ سے چوکی پر پہنچا۔ اب شیخ صاحب نے فرمایا "اب تم نے مجھے یہاں سے کیا کیا دیا" میں نے عرض کیا "جی نہیں" فرمایا "آتے تو چوک کی سیر کو ہیں جب وہاں سے سیدھی کھڑکیا تو کہتے ہیں چلو ناسخ کے شعر سنیں۔ نہ سمجھتے ہیں نہ بوجھتے ہیں محض دماغ پریشان کرتے ہیں۔ یہ پٹرا میں نے انھیں لوگوں کے لیے کی ہے۔ اب کہو کہ میرے پاس آئیں گے۔" یہ کہہ کر پٹرا اٹھوا دیا۔

جناب اُنس نے یہ نقل بیان کی۔ لوگوں کی یہ کیفیت تھی کہ مارے ہنسی کے لوٹے جاتے تھے۔

چونکہ اس صحبت کے سلسلہ میں میر کلو عرش کا ذکر بھی آگیا ہے۔ لہذا اُن کا بھی مختصراً ذکر کر دینا فرض سمجھتا ہوں۔ کسی تذکرہ نویس نے میر کلو عرش کے مدفن کا نشان نہیں دیا ہے۔ یہ امر اتفاقی ہے کہ رشید نے اس صحبت کے سلسلہ میں اُن کی قبر کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ عرش کی قبر اس امام باڑہ کے صحن میں ہے۔

میر کلو عرش — میر کلو عرش تخلص ناخلف شہِ سخن میر مرحوم کو زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے مگر اُن کی خوش گوئی زبان زدِ عوام تھی۔ جناب اُنس سے قدیمانہ مراسم تھے۔ اور کوئی ذاتی آمدنی بھی نہ تھی اس وجہ سے میر صاحب ہی کے پاس رہتے تھے۔ یہ اُنس صاحب کی وضع داری اور فراخ دلی تھی کہ عرش مغفور کو کبھی شکایت کا موقع نہ دیا۔ ورنہ ممکن تھا کہ میر کلو عرش ایسا سخن گو لکھنؤ ایسے شہر میں کسی دوسری جگہ رہ کر بھی اپنی زندگی عزت سے گزار سکتا تھا۔ ہاں یہ لطفِ شعر گوئی اور صحبتِ اہلِ علم اُن کو اور کسی جگہ میسر نہیں ہو سکتی تھی۔ پرانے لوگ تھے

زندگی ایک روش پر بسر کرنا پسند کرتے تھے۔ اگر موجودہ طرزِ تمدّن کی اف[illegible] نظر ڈالو
تو اُس کے آگے ہیچ معلوم ہوتا ہے۔

حلیہ | میر کلو عرش کی رنگت سانولی کشیدہ قامت تھے۔ اوسط کا جسم تھا۔ سر پہ پٹھے تھے
اونچی چولی کا انگرکھا اور کلی دار پائجامہ استعمال کرتے تھے گھیتلا جوتا۔ یا بوٹ پہنتے تھے۔
آخر عمر میں بسبب پیرانہ سالی کمر خم ہوگئی تھی۔ اور افیون بھی کھانے لگے تھے۔ ہر وقت
آنکھیں بند رہتی تھیں حقّہ سامنے لگا رہتا تھا۔ جناب رشید جناب حمید اکثر اُن سے
مہذب مذاق کر لیا کرتے تھے۔ مثلاً اُن کے سامنے حقّے سے چلم اُتار کے دوسرے [illegible]
رکھدی اور غائب ہوگئے۔ انھوں نے تھوڑے سے مراقبہ کے بعد جب کش لیا تو احساس
ہوا کہ بغیر چلم کا حقّہ بول رہا ہے۔ اب آنکھ کھولی تو دیکھا کہ چلم ندارد ہے۔ صرف یہ کہہ سکے [illegible]
کی "یہ لڑکے بڑے شریر ہیں" وضع داری کی اس قدر پابندی کی کہ انتقال بھی یہیں ہوا
اور دفن بھی یہیں ہوئے۔ میر محمد جان صاحب شاد انھیں سے اصلاح لیا کرتے تھے۔

ایک صاحب شاد مرحوم کی زبانی ناقل ہیں کہ میر کلو عرش نے وضع یہ [illegible]
کر لیا تھا کہ پانچ بجے قریب شاہ تحسین کی مسجد کے چبوترہ پر بیٹھا کرتے تھے اور چاروں طرف
شعرائے نامی ہوتے تھے۔ بڑے نازک مزاج تھے کسی رئیس کی طرف نظر اٹھا کے نہ دیکھتے
تھے" یہ وہی تحسین کی مسجد ہے جہاں میر کلو عرش کا نازک مزاج باپ میر تقی میر فاقہ مستی
کی حالت میں ایک دفعہ بیٹھا ہوا تھا کہ سعادت علی خاں بہادر کی سواری سامنے
سے نمودار ہوئی "نگاہ روبرو" کی صدائیں بلند ہوکر بڑے بڑے سرکش کا سر تسلیم خم
کر دی جاتی تھیں۔ مگر اس بادشاہِ سخن پر شوکتِ شاہی کا کچھ بھی اثر نہ ہوا حتیٰ کہ سلام
تک نہیں کیا۔ سعادت علی خاں بہادر کو نہایت ناگوار ہوا۔ اور انشا سے جو اُس وقت

ہم رکاب تھے پوچھا یہ کون شخص ہے۔ اُنھوں نے عرض کیا کہ یہ وہی گدا ہے جس کا ذکر اکثر حضور میں آچکا ہے۔ اور شاید اس وقت بھی فرمایا ہوگا۔ سعادت علی خاں نے ہواخوری سے واپس آکے ایک ہزار روپیہ اور خلعت میر صاحب کو بھیجا جسے اُنھوں نے ہزار وقت منظور کیا۔" (ماخوذ از آبِ حیات)

عرش کی نظر استغنا پسند رہ اُنکی طبیعت کو قبائے زربفت سے بہت نفرت تھی۔ آخر عمر کے تو بیٹھ گئے تھے۔ ذیل کے دو شعر رشید مرحوم کی زبانی سنے گئے تھے۔ دیوان میں موجود نہیں۔

نذر ستہ ہوئی نہیں خبر رفتگان مجھ — یوسف وہ ہوں کہ جس کو لیا کاروان نے

سے یار کو دیں بھی نہیں اکیلا نظر — لے جائے گی یہ وحشتِ دل کہسار ہے

اب میں تیر اندازی کے حالات کی طرف آتا ہوں۔ اور اُن کے واقعات مختصراً بیان کرتا ہوں۔

اُنس اور مواشش | زمانہ شاہی میں آپ کا نام چنداولوں پر تھا اور سو روپیہ تنخواہ ماہوار دربار کی سرکار سے ملتے تھے لیکن اُن کو بھی دربار میں مثل اپنے والد کے رسوخ حاصل نہ ہوا اور سبب اس امر کا وہی آزادی کی جھجک تھی۔ منورالدولہ بہادر سے اور ان سے نہایت تپاک تھا۔ ممکن ہے ان دونوں صاحبوں کی دوستی کے کچھ اسباب ہوں لیکن ہم کو جو کچھ معلوم ہے وہ یہ ہے کہ جناب اُنس کو فن تیراندازی میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ گویا کبھی تیر خطا ہی نہ کرتا تھا۔ منورالدولہ بہادر کو بھی تیر لگانے کا بہت شوق تھا۔ اکثر شکار میں ان دونوں صاحبوں کا ساتھ رہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُن کو اِن سے بہت اُنس تھا۔ منورالدولہ بہادر کی محبت کا اندازہ اس حکایت سے ہوتا ہے۔

واقعہ | ایک مرتبہ منورالدولہ بہادر نے شکار پر تشریف لے جانے کا ارادہ کیا۔

ملازموں کو حکم دیا کہ سامان درست ہو۔ جب تیار ہو گیا۔ آدمی کو حکم دیا کہ جناب اُنس
کی خدمت میں جاؤ اور ہماری طرف سے کہو کہ سامان شکار تیار ہے۔ حضرت آپ کی دیر ہے
آدمی روانہ ہوا اور جناب اُنس کی خدمت میں پہنچ کر عرض کیا۔ یہ فوراً اُٹھے اور اپنا سامان
درست کرنے لگے۔ جب جناب اُنس کے آنے میں دیر ہوئی تو منور الدولہ نے ہاتھی
منگوایا اور اُس پہ سوار ہوئے۔ اور برابر اپنے صاحبزادہ امجد علی خاں بہادر کو بٹھایا۔
اور یہ حکم دے کر کہ جناب اُنس تھوڑی دیر میں تشریف لانے والے ہیں۔ اُن کو
فلاں سواری پر روانہ کر دینا۔ اور شکارگاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ دو ہی قدم فیل
کوہ پیکر نے جنبش کی تھی کہ فنس جناب اُنس کی نمودار ہوئی۔ عرض کیا گیا کہ میر صاحب قبلہ
تشریف لا رہے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے وہ سامنے فنس آ رہی ہے۔ فیلبان کو حکم دیا کہ
ہاتھی روکے۔ اُس نے روک لیا۔ اتنے میں میر صاحب کی فنس بھی آ پہنچی۔ کہاروں
نے راہول پھرا کہہ کر فنس کاندھوں سے اُتار کر زمین پر رکھی۔ میر صاحب باہر تشریف
لائے سلام کیا۔ جواب سلام دینے کے بعد فرمایا کہ معاف کیجیے گا۔ آپ کو کسی قدر
دیر ہوئی۔ اور یہاں آتش شوق اس قدر بھڑکی کہ بغیر آپ کے روانہ ہونے پر مجبور ہو گیا
یہ فرما کر ہاتھی کو بٹھانے کا حکم دیا۔ جب وہ بیٹھا تو اپنے صاحبزادہ سے فرمایا کہ تم دوسری
سواری پر آؤ۔ اور میر صاحب سے کہا آیئے ہم نشیں میر صاحب نے کہا آپ صاحبزادہ کو
کیوں تکلیف دیتے ہیں۔ میں دوسری سواری پر آ جاؤں گا۔ لیکن منور الدولہ بہادر نے
نہ مانا اور کہا۔ ارے بھئی آؤ ہم تم باتیں کرتے چلیں گے راستہ خوب کٹے گا اور میر صاحب کو
اپنے ساتھ بٹھایا۔ اور روانہ ہو گئے۔ امجد علی خاں بہادر کو بمقتضائے سن یہ امر ناگوار ہوا اور
اتنا کہ شکار پر تشریف بھی نہ لے گئے۔ بلکہ اپنے دولت خانہ پر واپس آ گئے اور کئی روز تک

اپنے والد ماجد کے اصرار پر صبح دسترخوان پر جہاں روزانہ کھانا کھاتے تھے نہ حاضر ہوئے
باپ نے بھی نہ بلوایا رفتہ رفتہ یہ بات سب کو معلوم ہو گئی۔ تا اسکہ معزز مصاحبوں نے
امجد علی خاں صاحب بہادر کو سمجھایا اور یہ دسترخوان پر حاضر ہوئے منورالدولہ بہادر نے
فرمایا۔ تم کئی روز سے کہاں تھے کہ کھانے میں شریک نہ ہوئے عرض کیا۔ کچھ طبیعت اچھی
نہ تھی۔ فرمایا۔ یہ تو بہانہ ہے۔ ہم کو جو سبب ہے وہ معلوم ہے۔ اگر تم زندگی بھر کھانے میں
نہ شریک ہوتے تو ہم بھی زندگی بھر نہ بلواتا۔ یاد رکھو! اُنس اور منورالدولہ ایک روح
اور دو قالب ہیں۔ جناب اُنس کو بھی منورالدولہ سمجھو۔ اور اگر یہ نہ سمجھو تو چاہو تو ضرور ہی
سمجھو۔ فرماں بردار بیٹے نے گردن جھکالی۔

لکھنؤ اور سنہ ۵۷ء غدر

اس سے قبل تحریر ہو چکا ہے کہ جناب اُنس کا اہتمام مجسٹریٹوں میں تھا جب انقلاب
سلطنت ہوا اور واجد علی شاہ کلکتہ بھیج دیئے گئے تو دوسرا سال سنہ ۱۸۵۷ء کے غدر میں
سب ہی کو بھاگنا پڑا۔ سرکار کمپنی کے حکم سے سارا شہر خالی کرایا گیا ان کا خاندان بھی
کہیں چلا گیا۔ گوروں اور سکھوں نے تمام شہر کا نقد و جنس لوٹ لیا۔ ان کا بھی مال و اسباب
غارت ہو گیا۔ امن و امان ہو جانے پر سب آکر آباد ہوئے۔ ان کا خاندان بھی آیا چونکہ
مال و متاع لٹ گیا تھا اور کوئی ملازمت کا سلسلہ نہ تھا۔ اس وجہ سے تکلیف میں
بسر ہونے لگی اور ایک عرصہ تک یہی کیفیت رہی۔ اور ان مصائب نے اُنس کے جوہر
قناعت پر اور جلا کی لیکن بمفاد اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا اُن ساعتوں کے آثار بھی ظاہر ہونے
لگے جو آئندہ ایک زمانہ تک اُنس کو ایک فردِ فارغ البال کا لقب عطا کرنے والی تھیں

اُنس برسرِکار ہوتے ہیں

جب نواب ملکہ جہاں جو محمد علی شاہ کی بی بی تھیں لکھنؤ آئیں تو اُن کو ایک
داروغہ کی ضرورت ہوئی۔ ایک تحریر منورالدولہ بہادر کے پاس اس مضمون کی بھیجی

تم ہمیشہ سے ہمارے یہاں کے خیرخواہ رہے ہو اور امید ہے کہ اب بھی تمہارا وہی خیال ہو گا۔ ہم کو ایک لائق اور متدین اور منتظم داروغہ کی ضرورت ہے اگر تمہارے علم میں کوئی ایسا شخص ہو تو ہمارے پاس بھیج دو۔ اس تحریر کے دیکھتے ہی منورالدولہ کے ذہن میں مناسب انسان یہی آئے۔ آدمی بھیج کر ان کو بلوایا اور وہ تحریر دکھا کر کہا کہ میں نے آپ کو تجویز کیا ہے اور اسی وجہ سے آپ کو بلایا ہے۔ انھوں نے انکار کیا۔ اور کہا عورت کی ملازمت میں ناپسند کرتا ہوں قصہ کوتاہ منورالدولہ بہادر نے اصرار کیا کہ میر صاحب کو مجبوراً منظور ہی کرنا پڑا۔ منورالدولہ بہادر نے نواب ملکہ جہاں کو جواب میں لکھ دیا کہ میں نے موافق آپ کی منشا کے ایک صاحب کو تجویز کر دیا ہے اور وہ فلاں روز حاضر ہونگے۔ میر صاحب قبلہ اس قدر مفلس تھے کہ لباس کا انتظام بھی جیسا کہ چاہیے نہ تھا۔ اور اس فکر میں بیٹھے ہوئے تھے کہ کہاں سے لباس کا انتظام کروں۔ کہ اتنے میں جہاں قدر بہادر کے استاد مولوی شیخ احمد حسین صاحب جو میر صاحب کے شاگرد تھے آئے اور متردد دیکھ کر عرض کیا کہ آج کچھ میں آپ کو متفکر پاتا ہوں۔ فرمایا کچھ نہیں۔ انھوں نے فرمایا میں نہ مانوں گا کوئی نہ کوئی فکر تو ضرور ہے۔ میر صاحب قبلہ نے سارا قصہ بیان کر دیا وہ سن کر خاموش ہو گئے۔ اور بعد اس کے چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر آئے اور میر صاحب کی خدمت میں ایک رومال جس میں چالیس اشرفیاں بندھی ہوئی تھیں پیش کیا میر صاحب کو اپنی تمام عمر میں ایسا اتفاق نہیں ہوا تھا مارے شرم کے پسینے پسینے ہو گئے۔ گردن جھکا کر صاف انکار کر دیا۔ انھوں نے عرض کیا۔ آپ کچھ اور خیال نہ فرمائیے میں آپ کو قرض دیتا ہوں۔ جس وقت آپ کے پاس ہو۔ آپ مجھے دے دیجیے گا۔ میں بقسم کہتا ہوں۔ کہ لے لوں گا۔

اس پر بھی میر صاحب نے انکار ہی فرمایا۔ لیکن انھوں نے اصرار کو اس حد پر پہنچایا
کہ ان کو لیتے ہی بن پڑی۔ میر صاحب نے کپڑوں کا انتظام کیا۔ اور تاریخ معینہ پر
ڈیوڑھی پر حاضر ہوئے۔ محل دار نے جا کر دست بستہ بیگم صاحبہ سے عرض کی "حضور
وہ میر صاحب حاضر ہیں" بیگم صاحبہ نے فرمایا۔ "کون" محل دار نے کہا "حضور یاد تو ہوگا شاید
یاد نہیں رہا۔ بھلا سا بتایا تھا۔ وہی میر صاحب جن کے بارے میں منور الدولہ کا رقعہ
لکھا تھا۔" فرمایا۔ "ہاں ہاں۔ انھیں جا کر بٹھاؤ" پھر پردہ کرا کے اندر بلایا۔ اور بعد آداب و تسلیم کے
آیا۔ سو روپیہ ماہوار کی تنخواہ مقرر کی۔ اور اسی وقت ایک ہزار روپیہ اور ایک خلعت
مرحمت فرمایا۔ میر صاحب اپنے فرض منصبی کو انجام دینے لگے۔

پرانے سرکاری نوٹ کیسے بکے

ایک روز ملکہ جہاں نے فرمایا "دادا صاحب کے پاس سے پانچ بارہ لاکھ کے
پرانے سرکاری نوٹ تھے۔ صندوقچہ میں رکھے تھے۔ ان کو کچھ نہ سمجھا۔ نوٹ میں خاتمہ ہو گئے
کسی طرح ان کا پتہ لگاؤ۔ شاید مل جائیں۔" میر صاحب نے عرض کیا۔ "بہت
خوب۔ خیال رکھوں گا لیکن جہاں تک میں خیال کرتا ہوں۔ ان کا ملنا دشوار ہے کیونکہ
صاحب تاریخ اودھ لکھتے ہیں۔ بعد غدر نوٹوں کی اس قدر بے قیمتی ہوئی تھی
کہ بیان سے باہر ہے۔ ادنیٰ ادنیٰ آدمیوں کے پاس ہزاروں کے نوٹ دکھائی دیتے
تھے۔ مگر سرکار نے ممانعت کر دی تھی۔ کہ کوئی نوٹ نہ خریدے۔ اس پر بھی ہزار کا نوٹ
دس روپیہ کو فروخت ہو گیا اور لوگ مالا مال ہو گئے۔ چونکہ ممانعت خرید ہو چکی تھی۔
لہذا ملکہ جہاں کے نوٹ بک نہ سکے تھے۔ عجب اتفاق پیش آیا۔ یا یہ کہیے کہ اس کی
قسمت جاگی۔ وہ صندوقچہ ایک سپاہی لے گیا تھا۔ اس میں جو کچھ نقد تھا وہ تو اس نے لے لیا
مگر نوٹ اس کے مطلب کے نہ تھے۔ ان کو لے کر ابو تراب خاں صاحب جن کا کہ مشہور

ان کے پاس گیا۔ انھوں نے پانچ سو دے کر اُن سے لے لیے۔ یہ خبر میر صاحب کو بھی کسی ذریعہ سے معلوم ہوئی۔ میر صاحب اُن کے پاس گئے۔ اور دریافت کیا۔ انھوں نے کہا۔ ہاں میں نے یہ مقدار دے کر لے لیے ہیں۔ میر صاحب نے کہا۔ وہ نوٹ ملکہ جہاں کے ہیں۔ آپ انھیں دے دیں۔ اور جو رقم آپ نے دی ہو وہ مجھ سے لے لیں۔ انھوں نے جواب دیا۔ میں اس رقم پر نہ دونگا۔ بلکہ اس مثل کے موافق۔ کہ "جاتا دھن دیکھیے تو آدھا دیجیے بانٹ" کچھ لاکھ روپیہ لونگا۔ غرض کہ میر صاحب دس ہزار تک دیتے رہے مگر یہ معاملہ طے نہ ہوا +

نوٹ مل گئے

شاہی زمانہ میں میر صاحب نے ایک انگریز کو پڑھایا تھا۔ اب اس وقت میں وہ چیف کمشنر ہو کر آئے۔ یہ جوان کو معلوم ہوا۔ یہ ملنے گئے صاحب اپنے اُستاد کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ نہایت احترام سے بٹھایا۔ اور بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اثنائے کلام میں میر صاحب نے نوٹ والا قصہ بھی بیان کیا۔ چیف کمشنر نے کہا۔ "کل ہم اُن کو بلوا کر دلوا دے گا" دوسرے روز ابوتراب خاں صاحب کے یہاں چپراسی پہنچا۔ اور جا کر کہا۔ چیف کمشنر صاحب نے آپ کو بلایا ہے۔ یہ سُن کر وہ گھبرا گئے اور ایک کھلبلی مچ گئی۔ اور سبب اس کھلبلی مچ جانے کا یہ تھا کہ اُس وقت جس پر باغی ہونے کا گمان ہوتا تھا۔ اُس کو سزائے موت یا اور دوسری سزائیں دی جاتی تھیں۔ غرض کہ ابوتراب خاں صاحب گئے صاحب نے نوٹ میر صاحب قبلہ کو دلوا دئے۔ اور پانچ سو روپیہ میر صاحب نے ابوتراب خاں صاحب کو دے دیئے۔
داروغہ صاحب خوش خوش نوٹ لے کر آئے۔ اور نواب ملکہ جہاں کے سامنے پیش کر دیئے۔ وہ مغفور میر صاحب کی اس کارگذاری پر بہت خوش ہوئیں۔

اور کھوئے ہوئے لوٹے کے مل جانے پر بہت تعجب کیا۔ اس حُسن سعی کی وجہ سے اُن کے دل میں بہت جگہ ہوگئی اور اُن کی بہت رعایت کرنے لگیں۔ بلکہ مثل عزیزوں کے سمجھنے لگیں +

نواب ملکۂ جہاں کی تنخواہ ہوگئی

دوسرا کار نمایاں میر صاحب سے ایسا ہوا جس کی وجہ سے نواب ملکۂ جہاں اُن کو بھائی کہنے لگیں۔ اُنھیں چیف کمشنر صاحب کے پاس کبھی کبھی جایا کرتے تھے۔ ایک روز صاحب نے کہا "آپ ہمارا اُستاد ہے۔ اگر کوئی کام ہو تو فوراً ہم سے کہیے ہم اُسے ضرور کر دے گا" انھوں نے کہا "ہمیں آپ سے یہی اُمید ہے۔ میرا تو اس وقت کوئی کام نہیں۔ البتہ میں جن کا ملازم ہوں اُن کا کام ہے۔ اگر آپ اُسے انجام دے دیں تو میں نہایت ممنون ہونگا۔ صاحب نے کہا وہ کیا؟ میر صاحب نے کہا۔ آپ کو معلوم ہے میں نواب ملکۂ جہاں کا داروغہ ہوں۔ اور وہ بی بی محمد علی شاہ کی ہیں افسوس ہے کہ سرکار کمپنی نے اُن کی طرف توجہ نہ کی۔ اور ایسی جلیل القدر بیگم کی کچھ تنخواہ نہ ہوئی۔ صاحب نے کہا۔ اچھا۔ ہم کوشش کرے گا۔ میر صاحب وقتاً فوقتاً وہ محبت نامے جو محمد علی شاہ نواب ملکۂ جہاں کو لکھتے تھے۔ اور یہ اُن کو لکھتی تھیں۔ اور دوسرے کاغذات شاہی تلاش کر کے نکالتے اور چیف کمشنر صاحب کو دکھلاتے رہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان پر نواب ملکہ جہاں کا مرتبہ ظاہر ہو گیا اور آخر کار انھوں نے ایسی رپورٹ کر دی۔ کہ کئی ماہ کے بعد ساڑھے چار ہزار کی پنشن کا حکم آگیا۔ صاحب نے یہ حکم میر صاحب کو سُنایا۔ میر صاحب کی اُس وقت کی خوشی کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ الغرض میر صاحب اپنی سعی میں کامیاب ہوئے۔ لیکن یہ سارا قصہ نواب ملکہ جہاں سے بیان نہ کیا۔ جب مہینہ ختم ہوا تنخواہ جا کر وصول کی۔ اور اُسے لیے ہوئے بیگم صاحبہ کی

خدمت میں آئے۔ اور سامنے لاکر رکھ دیئے۔ بیگم صاحبہ نے دریافت فرمایا یہ کیا ہے۔
میر صاحب نے عرض کی، آپ کی تنخواہ۔ بیگم صاحبہ نے کہا کیسی تنخواہ۔ میر صاحب نے
اول سے آخر تک سارا قصہ بیان کیا۔ بیگم صاحبہ ان کی اس کوشش پر بہت ہی خوش ہوئیں
اور اس روز سے ان کو بھائی کہنے لگیں۔ اور چاہا کہ اس کا صلہ خاطر خواہ دیں لیکن
میر صاحب نے انکار کیا۔ اور عرض کی اس کا صلہ یہی چاہتا ہوں کہ آپ کام بزرگان
دین کے مزارات کی زیارت کے لیے سفر عراق کو تشریف لے چلیے اور مجھ کو ساتھ لیجیے۔ بیگم صاحبہ
راضی ہوگئیں۔ سامان سفر درست ہوگیا۔ اور اس قصہ کے سفر کی تاریخ بھی معین ہوگئی۔

چونکہ میر صاحب قبلہ خود یہاں سے ہمراہ جا رہے تھے لہذا یہاں کے تمام انتظام
کے لیے ایک ایسے ہی دیانتدار شخص کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس لیے میر صاحب کے
صاحبزادے جناب صاحب تجویز ہوئے اور پچاس روپیہ ماہوار کی تنخواہ کی گئی
اور تمام کنجیاں ان کے حوالہ کی گئیں۔ اور نقد جنس و جواہرات اور تمام اثاثہ کی دو
فہرستیں تیار ہوئیں ایک جناب صاحب کو دی گئی۔ اور دوسری نواب ملکہ جہاں کے
پاس رہی۔ تحویل میں نقد روپیہ بارہ لاکھ تھا۔ غرض کہ یہ سب انتظام ہو کر بیگم صاحبہ
حج اور زیارت عتبات عالیات کو روانہ ہوگئیں۔ اور سات برس تک اسی سفر
میں رہیں۔ نواب ملکہ جہاں کی اس سات برس کی عدم موجودگی میں لکھنؤ میں بعض واقعات
جو گذرے ہیں وہ جناب صاحب کے حالات میں لکھے جائیں گے۔

میر صاحب کا علم و فضل

جنت آشیاں نواب کلب علی خاں صاحب بہادر جیسے علم دوست
اور قدردان اہل علم تھے سب کو معلوم ہے۔ کیسے کیسے باکمال فاضل عالم۔ شاعر۔ بلکہ
ہر فن کے جاننے والے۔ آپ کے دربار میں حاضر رہتے تھے۔ میر صاحب کے علم و کمال کا شہرہ

آپ کے سمع ہمایوں تک پہنچا۔ بہت مشتاق ہوئے۔ اور چند بار تحریر کے وسیلہ سے
طلب فرمایا۔ لیکن میر صاحب اس وقت ضعیف ہو گئے تھے۔ سفر کی صعوبت پیش نظر
رکھ کر پیرانہ سالی کا عذر واقعی کیا۔ آخر کار ۱۲۷۵ھ میں اپنے استاد جناب منشی امیر احمد صاحب
مینائی کو لینے کے لیے روانہ فرمایا۔ منشی صاحب لکھنؤ تشریف لائے۔ منشی محمد احمد صاحب
صریح خلف امیر مینائی بھی ہمراہ تھے۔ میر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ منشی صاحب نے کہا
میں آپ کے لینے کے لیے آیا ہوں۔ میر صاحب نے کہا دیکھیے میری یہ حالت ہے
منشی صاحب نے کہا۔ خدا جانے کہ عالم پیری ہے۔ لیکن آپ کو چلنا ضرور ہوگا۔ اور
میں امید کرتا ہوں کہ آپ بہ راحت و آرام پہنچیں گے۔ غرض کہ میر صاحب نے
منظور کیا اور خود مع جناب رشید و جناب تعشق کے روانہ ہوئے۔

اس زمانہ میں رامپور میں ریل نہ تھی۔ مراد آباد آئے۔ اور وہاں سے رامپور
پہنچے۔ دربار میں شرف ملازمت حاصل ہوا۔ جلال۔ امیر۔ داغ۔ تسلیم وغیرہم
موجود تھے۔ ایک عرصہ تک شعر و شاعری کا ذکر رہا۔ سلسلۂ سخن تاریخ پر پہنچا۔ اثنا میں ٹیپو
سلطان کی تاریخ بیان فرمانے لگے۔ اور بہت دیر تک بیان فرماتے رہے۔ ایک
مقام پر پہنچ کر خاموش ہو گئے۔ اور میر صاحب کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ اس کے
آگے اگر آپ کو یاد ہو تو بیان کیجیے۔ میر صاحب نے عرض کی بہت خوب۔ اور وہیں سے
بیان شروع کر دیا اور ایک عرصہ تک بیان کرتے رہے۔ اس کے بعد عرض کی کہ حضور
کی سمع خراشی کا خیال ہے۔ حکم ہو تو اور عرض کروں۔ مسکرا کر فرمایا۔ معلوم ہوا کہ آپ کو
تاریخ میں بھی دخل ہے۔
ایک غزل میر صاحب کی سنی۔ اور ایک غزل اپنی سنائی۔ آٹھ روز تک وہاں قیام ہوا۔

کئی مرتبہ دربار میں گئے۔ کبھی کبھی رفقا منزل میں بھی جاتے تھے +

داغ اور حیات انیس

ایک مرتبہ رفقا منزل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کہ فصیح الملک حضرت داغ آئے اور ایک کونہ میں ٹوپی اُتار کر بیٹھ گئے۔ اس زمانہ میں آپ میں آزادی زیادہ تھی۔ کسی نے میر صاحب کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ حضرت آپ سے واقف ہیں۔ جواب دیا۔ نہیں کہا میر انیس آپ ہی ہیں جلدی سے ٹوپی پہن کر سلام کیا۔ اور اُٹھ کر چلے۔ دوسرے دن قیام گاہ پر آئے۔ ہاتھ میں اپنا دیوان قلمی لیے ہوئے تھے۔ میر صاحب سے بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ چلتے وقت اپنا دیوان دیا اور عرض کیا۔ کہ وقت فرصت آپ ملاحظہ فرمایئے گا۔ میں نے ارادہ کیا تھا کہ چند غزلیں خود سُناؤں۔ مگر آپ کی تکلیف کا خیال ہوا۔ جناب داغ کے جانے کے بعد میر صاحب نے جناب رشید سے جستہ جستہ مقام سے پڑھوا کر سُنا۔ تیسرے دن جناب داغ کے تغزل کی تعریف کی اور کہا "دہلی عبارت آپ ہی سے ہے" جناب داغ سے اور جناب رشید سے بے تکلفانہ گفتگو اور ان کا اُٹھیں۔ اور اُن کا انھیں غزلیں سُنانا خالی از لطف نہیں۔

الحاصل ایک روز نواب صاحب بہادر سے وطن جانے کی اجازت چاہی۔ فرمایا۔ کہاں جایئے گا یہیں رہیے۔ عرض کیا۔ جی تو یہی چاہتا ہے۔ اس لیے کہ آپ سا باکمال قدرداں رئیس کہاں دستیاب ہوسکتا ہے۔ لیکن بُرا ہو ضعیفی کا کہ اس سعادت سے محروم رکھنے پر مجبور کرتی ہے۔ ایک رومال اور دوشالہ۔ اور چھ سو روپیہ مرحمت فرما کر رخصت کیا +

میر صاحب خط شفیعہ خوب لکھتے تھے۔ یہی خط شفیعہ زمانۂ شاہی میں اس قدر مروج تھا (اور واقعی مروج ہونے کے قابل بھی ہے) کہ ہر پڑھا لکھا اُس کی مشق کرتا تھا۔ مگر اُس

خط ... بہت لوچ کی ضرورت ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ بہت سے خوش خط حضرات شفیعہ اچھا نہیں لکھتے عام طور سے یہ خط ایرانیوں میں پایا جاتا ہے اکثر پرانے کتب خانوں میں فارسی کے قلمی نسخے ایک اسی خط میں لکھے ہوئے نظر آتے ہیں میری رائے میں یہ حروف شفیعہ خوش خط الفاظ سے زیادہ نظر کو بھلے معلوم ہوتے ہیں۔

سخاوت | میر صاحب میں فضیلت سخاوت درجۂ کمال پر تھی۔ جب کسی حاجت مند کو دیکھ لیتے تھے۔ اُس وقت اور کوئی خیال اُن کے دماغ میں راہ نہیں پاتا تھا۔ سوائے اس کے کہ کسی طرح جلد سے جلد اس کی حاجت روائی کی کوئی تدبیر کریں۔ اور بیشتر کامیاب ہی ہوتے تھے۔ جس محلہ میں رہتے تھے وہاں کے غربا کے لیے میر صاحب گویا حاتم ثانی تھے۔ جناب حمید فرماتے تھے کہ نادار اصحاب کی لڑکیوں کے لیے اکثر ایسی ایسی معقول رقمیں میر صاحب نے دی ہیں کہ لوگوں کو تعجب ہو گیا۔

واقعہ | ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ میر صاحب رکاب گنج میں کھڑے تھے۔ جاڑے کا زمانہ تھا۔ شالی رومال کاندھے پر پڑا تھا۔ نیچی چولی کی جامہ وار کی اچکن پہنے تھے جو جدید بنوائی تھی۔ اُن کو امیر صورت شریف وضع پاکر ایک سائل نے سوال کیا میر صاحب نے ایک رقم قلیل جیب سے نکال کر دی اُس نے کہا میں اور زیادہ کا محتاج ہوں۔ میر صاحب نے کہا کہ میرے پاس سوائے اس کے اور کچھ نہیں۔ سائل نے کہا۔ کپڑے تو ہیں۔ میر صاحب نہ معلوم اُس وقت کس عالم میں تھے ملازم سے کہا گھر سے لنگی مانگ لے۔ اس نے امتثال امر کیا۔ سب کپڑے اُتار کے فقیر کے حوالہ کیے۔ حالانکہ اُس بےچارے نے لجاجت سے کئی مرتبہ کہا کہ غریب پرور میری یہ غرض نہ تھی۔ مگر جب اُس نے میر صاحب کو جوش سخاوت میں برہم پایا۔

تو مجال عذر کہاں سے لاتا۔ ناچار قبول کیا۔ اور دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔

سیر چشمی واقعی میر انیس کو ایسا ہی سیر چشم ہونا چاہیے تھا۔ وجہ یہ تھی کہ ابتدا سے انھوں نے ایسی ایسی سرکاروں میں ملازمت کی تھی۔ جہاں شاہانہ شان و شوکت نظر آتی تھی کام وہ تفویض ہوئے تھے۔ کہ ہر وقت سیکڑوں بلکہ ہزاروں روپیہ ہاتھ سے نکلتے رہتے تھے حرصِ دُنیوی کا ذکر نہیں۔ اگر ایسا شخص بھی سخی نہ ہو تو تعجب ہے۔ علاوہ اوپر کی آمدنی کے جس کی کچھ انتہا نہ تھی۔ خود میر صاحب تنخواہ بھی معقول پاتے تھے یعنی دو سو روپیہ ماہوار اور یہ اُس زمانہ کا ذکر ہے جب کہ ایک روپیہ آج کل کے دس روپیہ کی برابر تھا۔ پھر اُس پر روزانہ کے عنایات مزید۔ چنانچہ جب میر صاحب نے کوشش کر کے نواب ملکہ جہاں بیگم صاحبہ کی تنخواہ کرائی۔ اُس وقت اُنھوں نے بجائے دو سو روپیہ کے چار سو روپیہ تنخواہ کر دی۔ اور بیس ہزار روپیہ نقد دیا۔ کسی دوسرے موقعہ پر ایک مرتبہ اور پچیس ہزار روپیہ اُسی قدر شناس بیگم نے میر صاحب کو عطا فرمایا تھا۔ تاکہ میر صاحب اولاد کے لیے کوئی جائداد خرید لیں اور وسیلۂ معاش قائم ہو جائے۔ مگر میر صاحب کا ہاتھ کھلا ہوا تھا۔ بھلا روپیہ کہاں رُک سکتا تھا۔ جو ملا صرف کیا۔ یہی وجہ تھی کہ نواب ملکہ جہاں کے انتقال کے بعد میر صاحب سیر چشم مفلس رہے۔

جب ملکہ جہاں کربلائے معلّٰی تشریف لے جانے والی تھیں اُن کے ہمراہ تقریباً دو سو آدمی تھے۔ اُن کے علاوہ میر صاحب سے جس نے سفر کربلا کی استدعا کی میر صاحب نے اُس کو بغیر بیگم صاحبہ کو اطلاع دیئے اپنے ساتھ لے لیا۔ اور اس طرح ایک کافی تعداد زائرین کی ساتھ ہو کے ذخیرۂ ثواب حاصل کیا۔

لطیفہ | میرزا محمد رضا برق اُستاد جلال لکھنوی ایک مقبرہ میں مقیم تھے۔ ایک مرتبہ بیٹھے ہوئے تھے کہ میر انیس صاحب کی فنس نکلی۔ کسی وجہ سے میر صاحب میرزا محمد رضا کے یہاں جاتے نہ تھے۔ برق میر صاحب کو دیکھ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور بہت جھک کے سلام کیا۔ آپ کی عادت تھی کہ صاحب سلامت بہت جُھک کے کرتے تھے۔ میر صاحب نے فنس میں سے اُسی طرح آپ کو بھی بہت جھک کے سلام کیا۔ میرزا صاحب نے کہاروں کو آواز دی۔ ذرا فنس کو روکو۔ اور میر صاحب سے پکار کر کہا۔ یہاں بھی آپ کبھی آیئے گا؟ کہا۔ ہاں آؤں گا تو ضرور مگر ابھی تو جی نہیں چاہتا +

انیس اور مشاعرے

نقل | شاہی زمانہ میں آغا علی خاں شاگرد میر علی اوسط رشک مرحوم نے ایک بہت بڑا مشاعرہ کیا۔ تمام شعرائے شہر جمع تھے۔ آغا علی خاں سے اور میر انیس صاحب سے قدیمی چشمک تھی۔ اس لیے خود تو نہ گئے۔ بلکہ جناب آغا حیدر صاحب نیشاپوری کے وسیلہ سے آپ کو بلوایا۔ میر صاحب جناب تعشق کو ساتھ لے کر پہنچے۔ دیکھا مشاعرہ شاعروں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ چوبدار سے دو کرسیاں منگوا کر باہر بیٹھے۔ آغا حیدر صاحب اور میر علی اوسط کو معلوم ہوا کہ میر صاحب آئے ہیں۔ فوراً اُٹھے۔ اور آواز دی "آیئے بھائی صاحب" انھوں نے کہا۔ اندر جگہ نہیں جب میری باری آئے گی چلا آؤں گا۔ مگر انھوں نے نہ مانا اور اندر بلا ہی لیا۔ اندر جا کر بیٹھے۔ جب ان کی باری آئی۔ غیر طرح غزل پڑھی۔ اُس کے بعد طرح میں پڑھی۔ ایک شعر پر آغا علی خاں صاحب نے کہا۔ جناب نے تو اس زمین کا خاتمہ کر دیا۔ گویا یہ فقرہ طنز آمیز تھا۔ میر انیس نے فوراً جیب میں غزل رکھ لی۔ آغا علی خاں اور دیگر حضرات نے کہا کیوں کیوں فرمایئے فرما

آغا علی خان سے تو کچھ نہ کہا۔ دوسروں کی طرف میر صاحب نے خطاب کر کے کہا۔ آپ کے فرمانے کے مطابق میں نے اس زمین کا خاتمہ کر دیا۔ اور آپ نے تعریف کا خاتمہ کر دیا۔ اب کیا پڑھوں گا۔

رؤسائے شہر اور انیس

شاہزادہ میرزا سلیماں قدر بہادر جو خاندان شاہان اودھ کے آخری مقتدر فرد تھے کبھی کبھی اکابرین لکھنؤ سے یا تو خود ملتے تھے۔ یا انھیں بلوا لیتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ میر انیس مرحوم کے پاس ہرکارہ طلب پہنچا۔ مگر میر صاحب نے عذر پیرانہ سالی کیا نواب مغفور رکاب گنج خود تشریف لائے۔ سڑک پر گاڑی رکی۔ میر انیس صاحب نے اپنی فنس لگوا دی۔ اور نواب صاحب کی فنس کے ساتھ ساتھ گھر تک تشریف لائے۔ اگرچہ میر صاحب کو اس وضیع مہمان نے بہت مجبور پا کر فنس کے ساتھ نہ چلنے کی خواہش کی مگر اس وضع قدیم کے پابند نے نہ مانا اور اپنے حسن اخلاق اور عقیدت کو یوں ظاہر کیا۔ میر صاحب نے کمرہ میں گاؤ تکیہ لگوا دیا تھا۔ نواب مغفور آ کر رونق افروز ہوئے۔ میر صاحب نے موافق رسم قدیم ایک اشرفی اور پانچ روپیہ نذر دکھائے۔ انھوں نے فقط ہاتھ رکھ دیا جب تک بیٹھے رہے شعر و سخن کے اذکار رہے۔ خود بھی اپنا کلام سنایا۔ اور میر صاحب سے بھی سنا۔ جب چلنے لگے تو میر صاحب کا دیوان باصرار اپنے ساتھ لے گئے جو اب تک ان کے صاحبزادہ شاہزادہ ثریا قدر بہادر کے پاس موجود ہے۔ اور میر صاحب کو ایک دو شالہ اور دو سو روپیہ بھیجے۔

جناب انیس وقت آخر بہت ضعیف ہو گئے تھے۔ دس جمادی الاول سنہ ۱۲۹۱ ہجری میں انتقال فرمایا۔ پچانوے برس کی عمر پائی۔ حکیم صفدر حسین صاحب مرحوم نے یہ تاریخ کہی جو قبر پر کندہ ہے۔ اسکنہ اللہ ریاض الجنۃ۔

۲ ۱۳ھ

اولادِ اُنس | محمد میرزا صاحب اُنس کے پانچ بیٹے تھے۔
حسین میرزا اعشق۔ احمد میرزا صابر۔ سید میرزا تعشق۔ سید عباس میرزا صبر
سید نواب میرزا عاشق +
ان سب حضرات کی شاعری کا سلسلہ استادِ وقت جناب شیخ ناسخ مغفور سے ہے
ان حضرات کا حال بھی مختصراً درج ذیل ہے۔

اشعار میر اُنس مغفور (شاگرد ناسخ)

رسا جو اُلفتِ زلفِ دراز ہو جائے — کمندِ بامِ حقیقت مجاز ہو جائے
تہیں لحد میں اُتارو تمہیں پڑھو تلقیں — کہیں تو صحبتِ آو نیاز ہو جائے
عطا ہو ضبط مجھے یا اجل سے کچھ کہہ دو — کوئی تو صورتِ اخفائے راز ہو جائے
غرض وفا و جفا سے نہیں وہ چال چلو — کہ مجھ میں غیر میں کچھ امتیاز ہو جائے

وفورِ شوقِ شہادت سے بے قرار آئے — حضور جلد برآمد ہوں جاں نثار آئے
کسی طرح نہ ملا قاصدوں کو خط کا جواب — ہزار بار گئے اور ہزار بار آئے

جان دی پر کی نہ منت اُس ستم ایجاد کی — بد دماغی دیکھنا میرے دلِ ناشاد کی
اپنی اُلفت کا مآل اچھا نظر آتا نہیں — اُن کو عادت بھولنے کی ہم کو عادت یاد کی
درد و غم سے بڑھ گیا ہے ربط ہجرِ یار میں — اب قیامت ہو گئی شادیِ دلِ ناشاد کی
مجھ سے اک بُت کی محبت میں کنارہ کر گیا — اب خدا صورت نہ دکھلائے دلِ ناشاد کی
کر کے تہمت بے قراری کی نہ آزردہ ہو یار — میں نے کس دن ہجر میں نالہ کیا فریاد کی

شعر گوئی کا مزا اے اُنسؔ کب باقی رہا
رو دیا جب حضرت ناسخؔ کی شفقت یاد کی

کیا مزے تو نے دیے ہیں رحمت اے تاثیرِ ضعف
لب تک آ سکتا نہیں شکوہ ہمارا دل میں ہے

رات بھر دل سے رہیں رنج و تعب کی باتیں
فرقتِ یار نے سنوائیں غضب کی باتیں

اتنی تخصیص پہ مسرور ہو دل واہ رے دل
چشم پوشی ہے رقیبوں سے اشارے ہم سے

طول میں ہیں جو ترے قد کے برابر گیسو
کہیں برپا نہ کریں فتنۂ محشر گیسو
واہ ری مہر و وفا عاشقِ گیسو جو ہوا
پھر نہ چھوڑے کبھی اس شوخ نے منہ پر گیسو

حسین میرزا عشق

لکھنؤ کے نامی مرثیہ گویوں میں تھے۔ دیوان اور مرثیوں کی جلد بھی چھپ چکی ہے
ان کا کلام اصولِ شاعری کی میزان میں تُلا ہوا ہے۔ جہاں انیسؔ و دبیرؔ کے کلام کے
لوگ مشتاق ہوتے تھے۔ وہاں ان کا کلام بھی وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا
اول الذکر دونوں صاحبوں کی شہرت کے برابر برابر ان کا شہرۂ کمال بھی تھا محقق فن
ایسے تھے کہ دوسرا نگاہوں میں نہیں سماتا تھا۔ خلاصہ یہ کہ لکھنؤ کے باکمالوں کی فہرست
اول میں ان کا نام نامی بھی نظر آتا ہے۔ ان کے پوتے جناب عسکری میرزا صاحب
مودبؔ، آبائی جاگیر نظم کے مالک ہیں اور آج کل لکھنؤ کے نامی مرثیہ گویوں میں سمجھے
جاتے ہیں۔ اور خوب کہتے ہیں۔

جناب مودبؔ کو رشیدؔ مرحوم سے شرف تلمذ حاصل ہے جس طرح جناب
رشیدؔ نے اپنے مرثیہ میں، جو سلطان سخن مجھ سے بڑی شانِ سخن میں ایک بیت پر
دستہ نہ ہوں کہ علی عشق کی مسند پر کہو،
کہہ کے شاگردی عشقؔ پر ناز کیا ہے۔ اسی طرح جناب مودبؔ نے ذیل کی رباعی میں
فخرا شاگردی رشیدؔ ظاہر کی ہے۔

عمّو ہیں رشیدؔ اُن سے یہ رشتہ ہے یہ عشقؔ کے شاگرد ہیں شاگرد رشید	دادا مرے عشقؔ اُن کے چچا شاگرد کیا ہے تلمیذ کا یہ سلسلہ بھی اچھا ہے

رجب کی ستائیس تاریخ اکرام اللہ خاں کے امام باڑہ میں سجاد حسین صاحب
ایک مجلس کرتے ہیں۔ اس میں جناب مودبؔ اپنا نیا مرثیہ سناتے ہیں۔ اس ماہ رجب
کی چوبیس تاریخ سے نئے مرثیوں کی مجالس شروع ہو جاتی ہیں۔ اور خاندان انیسؔ و دبیرؔ

وعشق کے حیثیت مرثیہ گو مثلاً عروج، رفیع، مؤدب، فائق، حسن، قدیم، فرید، رونق افروز منبر ہوئے ہیں۔ یہی ایک مرثیہ ہر ایک کی نسبت سال بھر تک اپنا سکہ قائم کرا دیتا ہے سنجیدہ طبیعتیں نقادانہ نظر ڈال کے کامیابی کی مختلف تعریفوں سے ہر ایک کو سرفراز کرتی ہیں۔ جو اس امتحان گاہ میں عہدہ برآ ہو گیا۔ اُس کی امیدوں کا کیا پوچھنا۔

جناب عشق نے بتاریخ ۲۴ شعبان ۱۳۱۳ھ روز دوشنبہ انتقال فرمایا۔

سید میرزا تعشق

لکھنؤ میں سید صاحب کے لقب سے مشہور تھے۔ غزل اور مرثیہ گوئی دونوں کے بادشاہ تھے۔ خداداد طبیعت نے مرثیہ گوئی کا ایک نیا اور بہر دل عزیز رنگ ایجاد کر لیا تھا جس مشاعرہ میں غزل پڑھ دیتے تھے۔ سامعین بیتاب ہو جاتے تھے۔ داد دینا کیسا کلام نے وہ اثر پایا تھا کہ لوگ رو دیتے تھے۔ ان کے کچھ مرثیے اور مختصر سا دیوان غزلیات کا طبع ہو گیا ہے۔ دیوان غزلیات جناب آبر مرحوم اڈیٹر رسالہ معیار چھپوایا

جناب تعشق سے میر انیس صاحب بہت محبت کرتے تھے۔ بلکہ ان دونوں بزرگواروں میں برادرانہ مراسم تھے۔ ایک معتبر ذریعہ سے سنا گیا ہے کہ میر انیس مغفور اکثر اپنا نیا مرثیہ آپ کو سُنا دیتے تھے۔ جس کی وجہ سوائے انتہائے اُلفت کے اور کیا ہو سکتی ہے۔

کم شہرت کی وجہ | سید صاحب نے اپنا زیادہ حصۂ عمر کربلائے معلّٰی میں صرف کیا جس کی وجہ یہ تھی کہ میر عشق مغفور کا چراغ لکھنؤ میں جل رہا تھا۔ مگر انھوں نے جو نئے مرثیے کہے اور مجلسوں میں پڑھے تو مرجعیت عام ان کی طرف ہونے لگی سمجھے کہ اگر میں یہ سلسلہ جاری رکھتا ہوں تو زمانہ میر عشق کا مدمقابل بنائے دیتا ہے جس کو یہ نا

کرتے تھے۔ لہذا دوبارہ زیارت کربلائے معلّی پر آمادہ ہوگئے۔ گویا ارادۂ ہجرت کرلیا۔ میر عشق کے انتقال کے بعد واپس آئے۔ اور پھر وہ شہرت حاصل کی کہ محتاج بیان نہیں۔ ان کے ایک فرزند سیّد نواب میرزا تعشق مرحوم تھے۔ یہاں ان دونوں حضرات کے مفصّل حالات بیان کرنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ مقصود میرا رشید کے حالات سے ہے۔ روشِ تحریر اس طرف کھینچ لائی تو ان حضرات کا بھی مجملًا ذکر ہوگیا۔

سیّد صاحب نے ستّر سال کی عمر پائی۔ ۲۴۔ رمضان المبارک روز شنبہ ۱۳۰۹ھ میں انتقال ہوا۔ باغ میر عشق میں زیر امام باڑہ ایک حجرہ ہے۔ اُس میں مدفون ہوئے۔ تاریخ وقت جناب مولوی علی میاں صاحب کامل مغفور نے یہ تاریخ وفات کہی۔

اززبانِ ہاتفِ غیبی بیاسخ گوہمش ۔۔۔ رفتہ سوئے مجلسِ جانِ پیمبر آں جناب
۱۳۰۹ھ

احمد میرزا صاحب صابر

جنابِ صابر۔ یہ محمد میرزا صاحب اُنس کے منجھلے بیٹے اور جناب رشید کے والدِ ماجد تھے۔

حلیہ و لباس | رنگت گوری تھی۔ ماتھا بلند۔ آنکھیں بڑی بڑی۔ کثرتِ کتب بینی سے نظر کمزور ہوگئی تھی۔ موٹے تازے تھے۔ رسمِ قدیم کے موافق سر پر پٹے تھے اعضا میں بہت مناسبت تھی۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ خوب صورت تھے وضع بالکل سادی تھی پنج گوشہ ٹوپی پہنتے تھے۔ کُرتہ نیچا۔ آدھ کلی کا مشروع کا پائجامہ ہوتا تھا۔ جوتہ گھیتلا اشرفی کا ببر علی کے ہاتھ کا بنایا ہوا۔ ببر علی اس وقت لکھنؤ میں گھیتلے جوتہ کی ساخت میں بہت مشہور تھا اکثر رؤسا و شرفائے شہر اس کے ہاتھ کا جوتہ پہنتے تھے۔ چنانچہ میر انیس میر مونس

جناب صابر نے ہمیشہ اسی کا بنا ہوا جوتہ پہنا کیا وضع کے پابند لوگ تھے۔

شوق تعلیم اور اعلیٰ علم سے بہرہ ور

جناب صابر بڑے ذی استعداد تھے۔ مولوی انور علی صاحب فرنگی محلی مرحوم سے درسیات ختم کیے تھے۔ اور بجائے خود کتب بینی سے اس قدر قوت علم بڑھائی تھی۔ کہ طالبانِ علم گھر پر درس لینے آتے تھے۔ ان کے نمایاں شاگردوں میں سے چند کے نام یہ ہیں۔ حکیم سید باقر مرحوم۔ میر آولاد علی مرحوم۔ شیخ ہادی علی مرحوم۔ میر عسکری مرحوم۔ شیخ بندا حسن علی مرحوم۔ جناب صابر تینوں زبانوں (یعنی عربی۔ فارسی۔ اُردو) میں شعر کہتے تھے۔ اور شاگردوں کے کلام پر اصلاح بھی دیتے تھے۔ کیفیتِ علم میں اس قدر سرشار تھے۔ کہ کبھی صنفِ شعر میں زیادہ نمایاں ہونے کی کوشش نہیں کی اور نہ اس قدر کہا کہ قابل اشاعت ہوتا۔

شاذ سے قطع نظر کرکے قاعدہ ہے کہ ایک صاحبِ استعداد اگر فطرتًا ذوقِ شعر رکھتا ہے تو اُس کو کبھی اس حد تک نہیں پہنچاتا کہ شاعری کے بڑھتے ہوئے خیالات اس کو مسائلِ علمیہ کی فکر سے باز رکھیں۔ جو کیفیت شاعر پر دورانِ نظم میں طاری ہوتی ہے اور جن کاوشوں سے وہ ایک خیال کو نظم میں ادا کرنا چاہتا ہے۔ اور کامیاب ہوکر خوش ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک درس دینے والا مسائلِ علمیہ کے حل میں غرق ہوکے وہ لطف اُٹھاتا ہے کہ فضلا ہی خوب سمجھتے ہیں +

شاعر کا بدل ما یتحلل دادِ سخن ہے۔ اور مدرس کے رُوحانی سرور کا سبب یہ ہے کہ جو کچھ اُس نے تقریر کی ہے وہ پڑھنے والے کے ذہن نشین ہو جائے۔ بہر حال جناب صابر نے اپنے وقت کو صرفِ علم کر دیا۔ اور شعر کی طرف توجہ کم کی آتش و ناسخ کے مشاعروں میں شریک ہوئے ہیں۔ اور ان دونوں سے دادِ سخن لی ہے +

اسی سلسلہ ۰ امجد علی شاہ کی تخت نشینی سے ایک سال قبل یعنی ربیع الاول ۱۲۶۱ ہجری میں جنابِ صابر کا عقد فردوسی ہند جناب انیس مرحوم کی صاحبزادی کے ساتھ ہوا۔ جن کا انتقال رشید کے سامنے ہوا + انیس مرحوم ان صاحبزادی سے خصوصاً بہت محبت فرماتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جنابِ صابر بھی بہت محبوب تھے جناب رشید فرماتے تھے کہ نانا جان مہینہ میں دو ایک مرتبہ والدہ کو دیکھنے ضرور تشریف لاتے تھے اور جنابِ اُنس مغفور کے ساتھ کھانا نوش فرماتے تھے۔ جتنے عرصہ تک قیام رہتا تھا ان دونوں بزرگوں میں فنِ شعر کے متعلق اس قدر دلچسپ ذکار رہتے رہتے تھے گویا دو بلبل چہک رہے ہیں۔ خاندان کے نوجوان رشید، حمید، سعید، جدید وغیرہم حاشیہ نشین ہوتے تھے۔ اور اس دعوتِ علمی سے ذخیرۂ معلومات لے کر اٹھتے تھے۔

نقل جنابِ حمید مرحوم فرماتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک جمعرات کو جناب نانا صاحب (یعنی جنابِ انیس) حسبِ معمول تشریف لائے۔ جناب دادا صاحب (یعنی جنابِ اُنس) سے گفتگو ہونے لگی۔ اثنائے کلام میں دادا صاحب نے جرأت مرحوم کا یہ شعر پڑھا۔

ع

ہمارے سر پہ چھائی ہیں بلائیں شامِ ہجراں کی ✻ وہ اپنے شغل میں ہیں بال ادھر کو لا اُدھر باندھے

نانا صاحب نے بہت تعریف کی۔ اور اپنے دونوں ہاتھ کانوں کے پاس لیجا کے اور چاروں انگلیوں کو یکے بعد دیگرے ایک دوسری حرکت دے کے دوسرے مصرعہ کو اس طریقہ سے ادا کیا۔ کہ اب تک وہ تصویر آنکھوں کے سامنے ہے۔ واللہ میر صاحب پڑھتے کیا تھے شعر کی تصویر کھینچتے تھے +

معاش جنابِ اُنس کے حالات میں لکھا جا چکا ہے کہ جب نواب ملکہ جہاں (زوجۂ محمد علی شاہ)

کربلائے معلیٰ جانے لگیں تو جناب احمد میرزا صاحب صابر اپنے والد کے عہدے کے ذمہ دار ہوئے۔ چند دنوں کے بعد جب میر انیس کا انتقال ہو گیا۔ تو یہی مختار عام ہو گئے اور پچاس روپیہ ماہانہ مقرر ہوئے۔

واجد علی شاہ اور جناب صابر

عہد واجد علی شاہ میں جناب صابر شاہی ملازم تھے یعنی مجرائیوں میں نام تھا۔ میر صاحب کی شرافت و دیانت ذاتی نے اس قدر بادشاہ کے دل میں جگہ کر لی تھی کہ انھوں نے آخر کار اپنی بی بی زہرہ محل کے یہاں کی داروغگی ان کے سپرد کر دی تھی۔

ایک روز جناب صابر دربار میں حاضر تھے۔ بادشاہ نے اُن سے مخاطب ہو کے پوچھا "تم محمد میرزا انس کے صاحبزادہ ہو" انھیں نے جواب میں عرض کیا "جانِ عالم ہاں" بادشاہ نے فرمایا "تم آئندہ اپنے کلام پر مجھ سے اصلاح لیا کرو" بنا برحکم ہمایون۔ جناب صابر نے چند غزلیں شاہ کو دکھائیں +

یہ زمانہ لکھنؤ کی بہار کا تھا۔ ہر شخص بے فکر ہر طرف سامانِ عیش و طرب موجود۔ گلزار ارم سے خوش آیند نغموں کی صدائیں اُٹھ اُٹھ کے تمام خوش اوقات حلقوں میں اپنا دلکش اثر پھیلا چکی تھیں۔ اور الناس علیٰ دین ملوکہم کا مفاد صرف بامحل تک پہنچ چکا تھا۔ ایسے مقامات پر جناب شعر کو جیسا رسوخ ہو سکتا ہے ظاہر ہے۔ فطرت سے لکھنؤ والے مجبور تھے۔ ورنہ اُس وقت کا ذوقِ شعر گوئی تو یہ کہتا تھا کہ اگر بس چلتا تو سارا لکھنؤ نظم میں باتیں کیا کرتا۔

زہرہ محل کو داروغہ کیا عطا ہوا تھا۔ ایک شاعر واجد علی شاہ کی طرف سے ملا تھا۔ کہ زہرہ محل کی جانب سے نظمًا چھیڑ چھاڑ ہوا کرے۔ اور اس طریقہ سے لطفِ محبت بہم پہنچا حاصل ہو۔ چنانچہ جب جانِ عالم کی عدم تشریف آوری کو دو چار روز کا عرصہ گذر جایا کرتا تھا

تو زہرہ محل کی طرف سے ایک محبت نامہ (شکایت نامہ معشوقانہ) نظم ہو کر جایا کرتا تھا۔ جو جناب صابر نظم کیا کرتے تھے مقتدر مکتوب الیہ کو معلوم تھا کہ صابر نظم کرتے ہیں۔ لہذا تبرکاً اس پر اصلاح بھی دے دیتے تھے +

جب ۵ رجب ۱۲۷۲ھ میں واجد علی شاہ کو سرکار کمپنی نے کلکتہ روانہ کر دیا تو لکھنؤ میں ایک انقلاب عظیم برپا ہو گیا جتنے سلیمن شاہی کی حالتوں کا تغیر اور ملازمین بندگان عالی کا تفکر میں کیا لکھ سکتا ہوں۔ صرف یہ کافی ہے کہ لکھنؤ کی روشن فضا میں تاریکی پھیل گئی عیش و عشرت کے ستارے دھندلے ہو گئے۔ فراغت کا چاند غروب ہو گیا۔ خلاصہ یہ کہ جس کا جدھر منہ اٹھا ادھر چلا آیا۔ واجد علی شاہ کے خاص وابستگان دولت ان کے ہمراہ کلکتہ چلے گئے۔ (فقیر اشہر کے پرنانا میر اسعادت خاں داروغہ چاندی خانۂ شاہی بھی ہمرکاب پادشاہ رہے اور ماہ ذی الحجہ ۱۲۸۵ھ کلکتہ ہی میں انتقال کیا) +

قناعت | اس مقام پر مجھ کو یہ ضرورت ہوئی کہ جناب صابر کی قناعت کے متعلق کچھ لکھوں کیونکہ یہ وقت ان کے لیے بہت سخت تھا۔ واجد علی شاہ سے شفیق آقا سے جدائی ہو چکی تھی غدر کی ہندسوز آگ نے بڑے بڑے خاندانوں کو برباد کر دیا تھا۔ خصوصاً دہلی اور لکھنؤ تو خاص مرکز تباہی تھے۔ رؤسائے باقیماندہ کے پاس اس قدر سرمایہ خود نہ رہا تھا کہ اپنی ہی آبرو قائم رکھتے۔ اور جن کے پاس تھا ان سے کسی کو چنداں امید پرورش نہ تھی +

جناب صابر کسی کے پاس نہ گئے۔ میر انیس مغفور یا ان کے والد ماجد میر انس مرحوم جو ماہانہ تنخواہ دیتے تھے۔ اسی پر بسر اوقات تھی۔ ان کو حالتِ عسرت میں دیکھ کر لوگوں نے کہا۔ آپ ملازمت کیوں نہیں کرتے۔ جواب دیا جب دل خواہ قدردانوں کو کہاں سے لاؤں

ملازمت | بہت دنوں کے بعد نواب ملکۂ جہاں کے یہاں اس وجہ سے سلسلہ ہو گیا تھا

کہ خود اُن کے والد بیگم صاحبہ کے نمک خوار تھے ۔ دوسرے یہ کہ اگر اس ملازمت کو قبول نہ کرتے تو گویا جناب اُنس کی نافرمانی تھی جس کو صابر ایسا صاحبِ استعداد اور فرماں بردار فرزند کبھی گوارا نہیں کر سکتا تھا +

صابر کا سفر کلکتہ واجد علی شاہ [illegible]

ملکہ جہاں کی عدم موجودگی میں جس دیانتداری اور بیداری سے جناب صابر نے کام کیا تھا اُس کے صلہ میں علاوہ اعترافِ خدمت کے کافی صلہ بھی ملا تھا جس وقت ملکہ جہاں سفرِ عراق سے واپس آئیں تو کچھ تبرکات (جیسا عام قاعدہ ہے) اپنے ہمراہ لائیں ۔ اور چاہا کہ واجد علی شاہ کے پاس بھی تحفۃً کچھ تبرک بھیجا جائے ۔ اب یہ سوال پیدا ہوا کہ کس کے ہاتھ بھیجا جائے ؟ یا تو جناب اُنس خود لے جائیں یا چھوٹے داروغہ صاحب (جنابِ صابر) کو یہ خدمت سپرد ہو ۔ ملکۂ جہاں نے یہ طے کیا کہ آخر الذکر کو یہ سربلندی بخشی جائے ۔ چنانچہ جناب صابر تبرکات لیکے کلکتہ پہنچے ۔ اُس زمانہ میں بادشاہ نقارخانہ واقع مٹیا برج میں تشریف فرما تھے ۔ جناب صابر دردولت پر حاضر ہوئے چوب دار شاہی نے باادب عرض کیا ؛ ظل اللہ فرستادہ نواب ملکہ جہاں بیگم صاحبہ حاضر ہیں " ارشاد ہوا ۔ بلالو " جناب صابر دربار میں گئے ۔ مجرا بجالائے ۔ فرمایا " بیٹھو " پہلی ہی نظر میں پہچان لیا ۔ اور فرمایا " تم تو ہمارے نوکر تھے " جناب صابر نے عرض کیا " جی جہاں پناہ " پھر فرمایا " تم تو بالکل بڈھے ہو گئے ۔ عرض کی " جب حضور سا آقا سر پر نہ رہا تو جوانی کہاں " اس عقیدت آمیز جواب نے شاہ کے دل پر اثر کیا ۔ گردن جھکالی اور کئی منٹ تک خاموشی کا عالم طاری رہا ۔

اس سکوت کا [illegible]

اس فقرہ نے واجد علی شاہ کے سامنے اُن کی عظمت کا پرانا نقشہ پیش کر دیا ۔ گویا وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ لکھنؤ ہرا اور قیصر باغ کی بارہ دری پیش نظر ہے

باگلزار ارم میں دربار گرم ہے۔ حاشیہ نشین اپنے اپنے اعزاز و مناصب کے مطابق شاہی مسند کے دونوں پہلوؤں پر بیٹھے ہیں۔ در دولت کے پردوں سے اطمینان کی ہوائیں آرہی ہیں شغل سور و سرور جاری ہے کہ ریذیڈنٹ یکایک دربار میں داخل ہوتا ہے اور کرچ کی سلامی دے کے ایک شقہ سرکار کمپنی پیش کرتا ہے۔ جس میں ایک طویل عبارت نظر آتی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے۔

"معاہدہ ۱۸۰۱ء کی پابندی آپ سے نہ ہو سکی۔ لہذا انتظام سلطنت اودھ خود کمپنی کرے گی۔ آپ کو اگر کچھ بطور عذر کہنا ہو تو کلکتہ پہنچ کر گورنر جنرل سے کہہ سکتے ہیں"

چہرہ کے مختلف تغیرات اور ایک عرصہ کے معنی خیز سکوت کے بعد اب بادشاہ نے گردن اُٹھائی۔ اور جناب صابر سے پوچھا "اب بھی کچھ کہتے ہو کہ عرض کیا" بالکل چھوڑ دیا" فرمایا "کیوں" عرض کیا" حضور کے تشریف لانے کے بعد جی نہ چاہا" جس کا جواب یہ ملا کہ جناب صابر مشقِ سخن جاری رکھیں اور اصلاح کے لیے کلکتہ بھیج دیا کریں۔ اس کے بعد تبرکات کے حاضر کیے جانے کا حکم ہوا۔ تبرکات کے خوان پیش کیے گئے۔ بہت خوش ہوئے دُرِ نجف کی تسبیح کو اُٹھا کے آنکھوں سے لگایا جناب صابر کو ایک بیش قیمت دوشالہ اور ایک رومال عطا ہوا +

عبادت | یہ معمول تھا کہ جناب صابر بلاناغہ تین بجے رات سے اُٹھتے تھے۔ اور بعد نماز صبح تلاوت قرآن مجید اور وظائف میں آٹھ بجے تک مصروف رہتے تھے۔ خدا پرستی جیسی قناعت کے وسیع میدان میں ہو سکتی ہے۔ دولت کے بندے اکثر اُس سے نابلد ہیں +

جناب ممدوح نے ۲۱ شوال روز چہارشنبہ ۱۳۱۱ھ بہتر سال کی عمر پاکر جانب ملکِ بقا رحلت کی +

مؤلف نے یہاں تک رشید کی ددھیال کے حالات لکھے۔ لہٰذا اب مختصراً نانہالی خاندان کو بھی بیان کر دیا جائے اگرچہ صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ رشید میر انیس کے نامی نواسہ ہیں۔ لیکن بہ مزید احتیاطاً کچھ نانہالی سلسلہ بھی حوالۂ قلم کیا جاتا ہے

رشید کی نانہال

رشید کے نانا ناخدائے سخن میر ببر علی انیس مغفور۔ بن میر مستحسن خلیق۔ بن میر حسن دہلوی تھے۔ جن کی مثنوی اور کلیات مشہورِ آفاق ہیں۔

میر حسن مرحوم نے اپنا خاندانی سلسلہ اپنے دیوان کے مقدمہ میں تحریر کیا ہے لہٰذا مختصراً (واقعاتِ انیس سے لے کر) یہاں نقل کیا جاتا ہے کیونکہ اس سے زیادہ معتبر تحریر اس سلسلہ میں دوسری ممکن نہیں۔ وہ عبارت یہ ہے۔

"اما بعد بر سخن دانانِ شاطر و دانشورانِ ماہر مخفی نماند کہ اصل ایں مؤلف (میر حسن) ابن میر غلام حسن بن میر عزیز اللہ بن میر ہدایت اللہ بن میر امامی موسوی از شاہ جہان آباد است۔ میر امامی موسوی در وقت شاہ جہاں از ہرات آمدہ بہ منصب سہ ہزاری ذات بین الاقران ممتاز گردید۔ فاضل متبحر و فقیہ بے مثل بودند گاہ گاہ بجہت تفریح طبع فکر شعر ہم می نمودند۔ پس ایں عاجز سخن را شاعری اجدادی میت نہ امروزی و قبلہ گاہی سلمہ اللہ تعالیٰ با ایں ہمہ قدرتِ علم چوں طبع سامعان در خور سمع بلند نیافتند۔ بقدر حوصلہ آنہا بطرف ہزل توسنِ قلم راندند۔ بحکم آنکہ



هصوب رشده

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز"۔ (رشید کو میر حسن علیہ الرحمہ سے منسوب کرنے کو اتنی عبارت کافی ہے۔)

رشتہ کی مشیر اول | جناب رشید کا عقد میر عسکری صاحب مرحوم کی دختر سے ہوا تھا۔ جو انیس مغفور کے منجھلے بیٹے تھے۔ اور اپنے والد ماجد ہی کے ساتھ رہتے تھے شعر و سخن سے کم دلچسپی تھی۔ اس وجہ سے غیر معروف ہیں۔

پیارے صاحب رشید

نام و سال ولادت | آپ کا نام سید مصطفیٰ میرزا تھا۔ فرماتے تھے۔ "سال جلوس واجد علی شاہ میرا سال پیدائش ہے"۔ چونکہ تاریخ جلوس واجد علی شاہ روز دوشنبہ ۲۹ صفر ۱۲۶۳ھ ہے۔ لہذا یہی رشید کا سن ولادت ہے۔ صغر سنی میں خاندان کے بزرگ افراطِ محبت سے پیارے پیارے کہا کرتے تھے۔ اس لیے یہ عرف ہو گیا۔ کیا تعجب ہے کہ یہ لفظ پہلے میر انیس کی زبان سے نکلی ہو۔ اور انھیں کے اتباع میں اور لوگ بھی کہنے لگے ہوں۔ انیس کے تمام نواسے اور نواسیوں۔ اور پوتے پوتیوں میں رشید سب سے بڑے تھے۔ ظاہر ہے کہ پہلی اولاد کو انسان کس قدر محبت کی نگاہوں سے دیکھے گا۔

آپ کے والد ماجد کا نام سید احمد میرزا صاحب، بن سید محمد میرزا انس، بن سید علی میرزا، بن سید ذوالفقار علی میرزا ہے۔ اسی طرح سلسلۂ نسب امام رضا علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔

متناسب الاعضا، بدن چھریرا کشیدہ قامت، ماتھا بلند، ستواں ناک، آنکھیں متوسط، پتلی میں کسی قدر نیلاہٹ، ہونٹ پتلے، رنگت گوری لیکن سُرخی غالب ہونے کی وجہ سے تیز گندمی، بلکہ کہا جا سکتا ہے چہرہ پر بہت متانت تھی۔ داڑھی خشخشی سر پر پٹے +

یہ حلیہ جناب رشید کی پیری کا ہے۔ اس سے اگر اُن کی حالت جوانی کا اندازہ کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے۔ کہ جوان خوش شکل ہونگے۔ خود فرماتے تھے: "کہ جب غدر کی پریشانیوں کے باعث سے میرانیس میرزا عباس صاحب کے مکان واقع منصور نگر میں۔ مع اہل و عیال چلے گئے تھے۔ تو میں بھی ساتھ تھا۔ بلوائیوں کی لوٹ مار جاری تھی۔ خاندان کے تمام مرد۔ اوقات مقررہ پر روز و شب باری باری پہرہ دیتے تھے۔ میری کمر میں بھی سبز منڈ کی بندھی ہوتی تھی" خلاصہ یہ کہ رشید بھی کبھی لکھنؤ کے بانکے جوان ہونگے +

وضع لباس | آخر عمر کی وضع بالکل سادی تھی مہین تنزیب کا انگرکھا پہنتے تھے۔ اُس کے نیچے کرتہ نہیں ہوتا تھا۔ البتہ کبھی کبھی جالسٹین کا شلوکہ گھٹنوں تک کا پہن لیتے تھے۔ دو پلڑی ٹوپی چکن کے کام کی پہنتے تھے۔ پنج گوشیہ ٹوپی جو اکثر مرثیہ خواں پہنتے ہیں۔ آپ نے کبھی نہیں پہنی۔ یہی دو پلڑی ٹوپی اُن کا خاندان پہنتا ہے۔ اب تک انیس کے خاندان والے پنج گوشیہ ٹوپی پہن کر زیب منبر ہوتے تھے۔ اور عشق کے خاندانی دو پلڑی ٹوپی پہن کے۔ یہی امتیازی فرق سر منبر خاندانی سلسلہ ظاہر کرتا تھا۔ (لیکن سوائے بڑھوں کے پنج گوشیہ ٹوپی کا رواج اُٹھ گیا) رشید نے جوانی میں بھی گھٹنا نہیں پہنا۔ کلی دار پائجامہ

پہنتے تھے۔ جب زیبِ منبر ہوتے تھے۔ تو ایک بڑا رومال دونوں زانوؤں پر ڈال لیتے تھے۔ جس کو مقتضائے ادبِ منبر کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

استعدادِ علمی | یوں تو جنابِ رشید نے بہت سے باکمالوں سے درس لیا ہے۔ لیکن یہ چند حضرات قابلِ ذکر ہیں۔

مولوی سید اصغر شاہ صاحب سے صرف و نحو کی کتابیں پڑھیں۔ مولانا میرزا محمد صاحب اخباری سے جو لکھنؤ کے ممتاز علما میں سے تھے۔ فقہ کی کتابیں ختم کیں۔ اسی سلسلہ میں مولوی محمد نقی صاحب نے جنابِ رشید سے سوال کیا "آپ نے اصولِ فقہ اُن سے نہیں پڑھے" ہنس کے فرمایا: "اصولِ فقہ سے اُن کو کیا علاقہ تھا" (اُستاد کے عقائد کا اثر شاگرد پہ ضرور پڑتا ہے۔ اگرچہ کافی اثر نہ ہو تو کم از کم اُس کے خیالات کی وقعت ضرور ہوتی ہے) منطق و فلسفہ مولوی انور علی صاحب حنفی سے پڑھا تھا۔ خلاصہ یہ کہ عربی کے درسیات کل نکلے ہوئے تھے۔ فارسی میں بہت اچھا ملکہ رکھتے تھے۔

رشید کو رَمل میں بھی کچھ دستگاہ تھی۔ اکثر لوگ دریافتِ حال کرنے آتے تھے۔ مگر پیرانہ سالی میں انکار کر دیتے تھے۔ تاہم اب بھی علی الصباح عورتیں اپنے بچوں کو لیے ہوئے آتی تھیں۔ اور ان سے مختلف امراض کے تعویذ لے جایا کرتی تھیں خصوصًا اگر کوئی مریض کُرل میں مبتلا ہوتا تھا۔ تو جنابِ رشید کا صرف تین روز پڑھ کر گلے پر ہاتھ پھیر دینا شفا بخشتا تھا۔ اُن کے بعد کُرل کی شکایت رکھنے والے حمید و سعید کے پاس آتے تھے۔ اور شفا پاتے تھے۔ رشید کی استعداد علمی کی تائید میں ذیل کی دو سطریں جنابِ محشر کی زبانی نقل کی جاتی ہیں۔

" میر وزیر علی اختر مرحوم ساکن گولا گنج لکھنؤ رشید کے بے تکلف اور ہم سن دوست تھے دورانِ گفتگو میں ایک روز جناب محشر سے فرمانے لگے "لکھنؤ کے لوگ رشید کی استعدادِ علمی میں شک کرتے ہیں۔ بھائی یہ بالکل غلط ہے۔ میں اور رشید شمس بازغہ ساتھ پڑھتے تھے"

فقیر مؤلف اکثر خدمتِ رشید میں جایا کرتا تھا۔ بیشتر نمازِ مغرب کے وقت اپنے دادا کی مسجد میں ملا کرتے تھے۔ ایک روز میں حاضر تھا۔ اتفاق سے ایک بلوچی سائل مسجد کے دروازہ پر آکر سوال کیا "براے خدا چیزے بدھید" رشید نے اس سے فارسی میں باتیں کرنا شروع کر دیں۔ تھوڑی دیر کے بعد میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا "فارسی بڑی میٹھی زبان ہے" اسی طرح ایک مرتبہ میں نے جناب مولانا محمد حسین صاحب قبلہ علامہ ہندی مرحوم سے عربی میں باتیں کرتے سنا تھا مجھ کو اس وقت تک علم نہ تھا کہ رشید عربی بھی پڑھے ہیں۔ میں نے متعجباً مولانا مرحوم سے پوچھا "کیا رشید عربی بھی پڑھے ہیں" فرمایا "وہ کیا نہیں پڑھے ہیں"

لکھنؤ کے مشہور طبیب حکیم باقر حسین صاحب مرحوم اور مولوی سید جواد صاحب وثیقہ نویس رشید کے ہم درس اور بے تکلف دوست تھے۔

اخلاق و مزاج | رشید کا خلق بہت وسیع تھا۔ جس کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ آج تک زمانہ مداح ہے۔ چونکہ خود فقیرانہ مزاج رکھتے تھے۔ لہذا جہاں تک ہو سکتا تھا دوسرے کے احساسات کو صدمہ نہیں پہنچاتے تھے۔ کسی سے اگر ایک دفعہ ملاقات ہو گئی اس کے بعد جب کبھی اس سے ملاقات ہوتی وہی تپاک وہی اخلاق۔ کیونکہ خود پرانے زمانہ کے ممتاز افراد کا بعض اٹھا چکے تھے۔ بلکہ خود بھی انھیں کا ایک آخری جزو

مشہور کیے جاتے تھے۔ اگر وہ پابندی وضع نہ کرتے تو اور کون کرتا +

نقل

جس زمانہ میں جناب محشر کا قیام کوچۂ شاہ چھبڑا میں تھا۔ یہ بہت بیمار ہوئے اور جس روز بعد صحت گھر سے باہر نکلے اُسی روز اُن کی عدم موجودگی میں جناب رشید عیادت کو تشریف لائے۔ جناب محشر گھر میں کہاں تھے جو ملتے۔ رشید نے کاغذ اور قلم دوات منگوائی خادم نے پنسل کاغذ حاضر کیا۔ اُس سے فرمایا "ہوا ہم لوگ اگلے وقت کے ہیں۔ ابھی تک نہ پنسل سے لکھا ہے نہ لکھنا آتا ہے۔ قلم دوات لاؤ" غرض کہ قلم دوات آئی۔ اور رشید یہ شعر لکھ کر واپس گئے۔

رکاب گنج سے مشتاق دید آیا تھا
ملے نہ حضرت محشر رشید آیا تھا

"جناب عزیز تحریر فرماتے ہیں۔ میں اپنی بدبختی سے بہت کم اُن کی خدمت میں جاتا تھا۔ مگر جب ملاقات ہوتی تھی۔ تو یگانگی و محبت اُن کے الفاظ سے ٹپکتی تھی۔ مجالس میں جب مرحوم مصروف مرثیہ خوانی ہوتے تھے اور مجھ پر نظر پڑ جاتی تھی۔ تو اکثر مرثیہ روک کر اپنے قریب بلا لیتے تھے۔ اور یہ اُنکی عزت افزائی تھی۔ بڑھاپے کا انکسار اور ہضم نفس اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ بعض وقت اُن کے چھوٹوں کو یہ دھوکا ہوتا تھا کہ یہ ہمیں بناتے تو نہیں ہیں مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا تھا۔"

اوقات ملاقات | رشید کی ملاقات کا یہ طریقہ تھا۔ اگر کوئی اوقات نماز میں پہنچا تو مسجد میں ملتے تھے۔ اور چائے بھجوا دیتے تھے۔ اور مہمان کے ساتھ خود بھی پی لیتے تھے۔ باتیں کرنے لگتے تھے۔ سننے والا اس بلبل قند مقال کی نواسنجیوں سے مست ہو جاتا تھا

اگر کوئی اوقاتِ نماز کے علاوہ کسی وقت پہنچا۔ تو امام باڑہ کے مشرقی کمرہ میں تشریف فرما ہوتے تھے۔ جہاں صرف اتنا سامان تکلف نظر آتا تھا۔ کہ ایک سفید فرش ہوتا تھا اور سہارا اگر جاڑوں کا زمانہ ہوا تو روئی دار کنٹوپ اور دگلا۔ اگر گرمیاں ہوئیں تو ایک کرتہ اور لنگی باندھے ہوئے۔ اللہ اللہ خیر صلاح۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے اسد

[illegible]

اکثر اعزّا و احباب نے کہا۔ آج کل ہر شخص شانِ ظاہری کا پابند ہے۔ اور بغیر اس کے چارہ نہیں۔ آپ کے پاس معززین آتے ہیں۔ اُن کے لیے ایک کمرہ مع سامان علیحدہ ہونا چاہیے۔ جس سے اُن کی نگاہوں میں آپ کی وقعت اور زیادہ ہو۔ جواب دیا۔ بس یہی ٹھیک ہے رشید بدل نہیں سکتا"۔

نازک مزاجی اہلِ کمال

آخری وقت میں بہت نازک مزاج ہو گئے تھے۔ اول تو پیرانہ سالی دوسرے دنیائے مرثیہ گوئی کے چند ناگوار و ناگفتہ بہ واقعات ایسے گزرے جنہوں نے رشید کو زود رنج بنا دیا تھا۔ اگرچہ کمال کے لیے نازک مزاجی لازم ہے۔ لیکن ہر سخن موقعہ و ہر نکتہ مقامے دارد۔

یہ ضرور ہے کہ ایک کامل شخص جو دنیا کو اچھی طرح دیکھ چکا ہو۔ اس کے نشیب و فراز سے اچھی طرح آگاہی حاصل کر چکا ہو۔ شہرت کی آخری حد تک پہنچ چکا ہو۔ اس کی طبیعت میں ایک قسم کا استغنا پیدا ہو جاتا ہے۔ جس سے عوام کی نظر غرور مراد لیتی ہے گو حقیقتاً ایسا نہیں ہوتا۔ وہ تمدنی نقطۂ نظر سے باہمی تعلقات کو برقرار رکھنے پر فطرتاً مجبور ہوتا ہے مگر اس کا طرزِ عمل خودداری اور بے پروائی کے نمایاں رنگ میں ڈوبا نظر آتا ہے۔ اخلاق ایک جوہرِ انسانی ہے یا وہ زیور ہے جس کے سوا کسی دوسری چیز سے انسان کی

آراستگی غیر ممکن۔ دنیا کا کوئی مذہب اخلاقی مواعظ کی تلقین سے خالی نظر نہیں آتا۔ اور مذہبِ اسلام کی تو بنیاد ہی اخلاق پر ہے۔

میری رائے میں کسی کو کیسا ہی کمال کیوں نہ ہو۔ مگر اُس کو اپنے اخلاق کو نہ بگاڑنا چاہیئے۔ اظہارِ اخلاق کا قدرتی آلہ زبان ہے۔ لہذا دوسرے سے جب گفتگو کی جائے تو ایسے الفاظ ہیں جن سے حدود اخلاق کا پتہ چلے۔

مبالغہ آمیز واقعہ — مؤلف واقعات انیس نے صفحہ ۱۰۴ پر انیس مغفور کے متعلق ایک واقعہ لکھا ہے جو مختصراً درج ذیل ہے۔

خود انیس مغفور نے ایک زمانہ تک لکھنؤ میں مرثیہ پڑھنا ترک کر دیا تھا۔ مگر ایک مدت کے بعد چند مجبوریوں سے حسینیہ افضل محل مرحومہ میں ایک مجلس پڑھی۔ جو مرثیہ پڑھا تھا اُس کا مطلع یہ ہے ؎

جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے

لوگوں کو کسی طرح یہ معلوم ہوا کہ اس مرثیہ کا نصف حصہ میر صاحب نے ایک شب میں تصنیف کیا تھا۔ اتفاقاً اسی سلسلہ میں انیس کی زود گوئی کا ذکر نواب محمد تقی خاں صاحب مرحوم کی صحبت میں بھی آگیا جس میں میر نواب صاحب مونس بھی موجود تھے انھوں نے اپنے بھاوج نگار بھائی کی عظمت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کہا یہ مشاقوں کے نزدیک ایک شب میں سو پچاس بند مرثیہ کے کہہ لینا کچھ حیرت انگیز بات نہیں ہے۔

لوگوں نے یہ واقعہ انیس کے گوش گزار کیا اور نہ معلوم کن الفاظ میں کہ انیس ناراض ہو گئے۔

بالمختصر مونس مرحوم جب اپنا مرثیہ اصلاح لینے کے لیے انیس کے پاس حاضر ہوئے

جس کا مطلع یہ ہے۔ (نہ معلوم اصلی مرثیہ کا یہی مطلع تھا یا کچھ اور)

[illegible] اکبر و [illegible] ہے مذکورِ وفاداری [illegible]

میر انیس اُس وقت حوض میں نہا رہے تھے۔ مونس کی صورت دیکھ کے کچھ یاد آگیا۔ فرمایا پڑھو۔ سنتے رہے۔ اور جب مرثیہ ختم ہوا۔ تو ایک دفعہ اپنے ہاتھ میں لے کر اُس کے سیاہ ورقوں کو حوض کے شفاف پانی میں سفید کردیا۔ اب حوض سے نکلے اور مونس کو اپنے ساتھ لیے ہوئے گھر پہنچے۔ اور جناب مونس کو وہ فقرہ یاد دلایا۔ جو انھوں نے نواب محمد حسین خاں صاحب کی محفل میں کہا تھا۔ اور تنبیہاً یوں کہا۔

"میر نواب یاد رکھنا اگر تمہاری تعلیموں کی یہی کیفیت رہی تو خورشید علی کی جوتیاں ہونگی اور تمہارا سر!"

[illegible]

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ قابل مؤلف نے۔ انیس کی زود رنجی۔ اور نازک مزاجی کے اظہار کے لیے یہ نقل لکھی ہے۔ یا مونس مرحوم کا اظہار سعادتمندی مقصود ہے بہرحال یہ تو ظاہر ہو گیا کہ انیس مونس نفیس تین شخصوں نے مل کر ایک وقت میں ایک مرثیہ تیار کیا۔ اور شاید دوسری نقل کا نتیجہ بھی مؤلف کے نزدیک یہی تھا۔ مگر غائر نظر ڈالنے والوں نے۔ اس سے ایک نتیجہ اور بھی نکالا ہے۔ اور وہ یہ کہ انیس کے اخلاق۔ اس قدر گرے ہوئے تھے۔ کہ نازک مزاجی نے اُن کو مغلوب کر لیا تھا۔ اول تو ایک برابر کا بھائی۔ اور کیسا بھائی جس کا کمال۔ انیس کے کمال کا ہمسر ہو [illegible] جس کی شخصیت اہل علم کی نگاہوں میں ایک پایہ حاصل کر چکی ہو۔ اُس کو انیس ایسا [illegible] ایسے مکروہ الفاظ سے مخاطب کرے۔ اور پھر خلوت میں بھی نہیں۔ بلکہ ایک نوعمر فرزند یعنی نفیس مرحوم کے سامنے۔ یہ فعل انیس کی ناعاقبت اندیشی پر محمول ہو سکتا ہے

اگر انیس سا معاملہ نا شناس فرزند ہوتا تو احتمال تھا کہ اپنے ایک بزرگ خاندان کو اپنی آئندہ عمر میں کوتاہ نظری سے دیکھتا۔

علاوہ بریں انیس مرحوم نے اس مرثیہ مشہور میں جس کا مطلع یہ ہے

"نمک خوانِ تکلم ہے فصاحت میری"

تفاخرِ شاعرانہ کرتے ہوئے اپنے اعزائے باکمال کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ مونس مغفور کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں ؎

بھائی وہ مونس خوش لہجہ و پاکیزہ خیال ۔۔۔ جس کا سینہ ہے بہر علم سے ہی مالا مال
یہ فصاحت یہ بلاغت یہ سلاست یہ کمال ۔۔۔ معجزہ گر نہ اسے کہیے تو ہے سحرِ حلال

اپنے موقع پہ جسے دیکھیے لاثانی ہے
اس گھرانے پہ ہی رحمتِ باری ہے

طبع سلیم اس واقعہ کو ہرگز ہرگز تسلیم نہیں کر سکتی۔ انیس جیسے مہذب سے یہ امر بالکل بعید ہے۔ بفرضِ محال اگر انیس سے ایسا کبھی ہوا تھا۔ تو اس واقعہ کو پبلک میں پیش کرنے کی ہرگز ضرورت نہ تھی۔ یہ واقعہ اُن انسانی کمزوریوں کی شق میں آتا ہے جو کسی فرد کامل کی حالات زندگی لکھتے وقت قلم کو نظر انداز کرنا چاہیے۔

مذہب | بعض تذکرہ نویسوں نے نہیں معلوم شاعروں کے مذہب سے کیوں بحث نہیں کی ہے میں نہیں کہہ سکتا کہ ان لوگوں نے اس میں کیا مصلحت رکھی ہے سب سے زیادہ تعجب مولانا شبلی مرحوم پر ہے۔ جو اس دورِ جدید کے مشہور انشا پردازوں میں سے تھے۔ اور نیز ریسرچ کے طرز تحریر سے اُن کے قلم کو خاص لگاؤ تھا۔ انھوں نے بھی شعر العجم میں شاعر کے مذہب سے بحث نہیں کی۔ البتہ شاذ کسی کے عقائد کو مجملاً

بیان کر دیا ہے۔

بہرحال جس شخص کے حالات تصریحاً لکھے جائیں۔ اُس کے مذہب پر بھی پوری روشنی ڈالنی چاہیے۔ تاکہ آئندہ نسلیں اُس کے متعلق تاریکی میں نہ رہیں۔ اور قلمی فساد پیدا نہو۔ مولوی الطاف حسین حالی مرحوم نے غالب کے باب میں کس قدر لکھیڑ اکیا ہے حتیٰ کہ اُن کو کھینچ تان کر تفضیلیہ ثابت کر دیا۔ اگرچہ تھوڑی دیر کو فرض کر لیا جائے کہ غالب سنّی تھے تو مذہب شیعہ میں کونسا ضعف پیدا ہوتا ہے۔ اگر شیعہ تھے تو مذہب سنّی میں کونسی کمزوری آئی جاتی ہے۔ بہرحال غالب شیعہ تھے۔

جناب صفیر بلگرامی۔ شاگرد جناب غالب۔ و مرزا دبیر و سحر لکھنوی اپنے تذکرہ جلوۂ خضر میں لکھتے ہیں۔ (میں پوری عبارت نقل نہ کروں گا بلکہ مناسب مقام)

"بندہ ۱۲۷۱ھ میں اپنے نانا حضرت صاحب عالم سجادہ نشین مارہرہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہاں حضرت غالب کا ذکر آیا۔ نانا صاحب سے اور اُن سے ایک خاص ربط تھا۔ میں نے خواہش کی کہ غالب کا شاگرد ہوں۔ نانا صاحب نے ایک عریضہ مع دو غزلوں کے ارسال خدمت غالب کیا ۱۲۷۵ھ میں حضرت غالب کی زیارت کا اشتیاق ہوا۔ آرہ سے مارہرہ پہنچا۔ اور وہاں سے اپنے منجھلے ماموں حضرت شاہ عالم کے ساتھ دہلی روانہ ہوا۔ بلی ماروں کے محلہ میں حضرت غالب کے پاس پہنچا۔ مجھ کو پوچھا یہ کون ہیں۔ میرے ماموں نے کہا "صفیر آپ کے شاگرد" اتنے میں نواب ضیاء الدین خان صاحب تشریف لائے۔ اور دوسری باتیں چھڑ گئیں۔

ہم کو اور ماموں صاحب کو نواب صاحب موصوف کے مکان میں
قیام کی جگہ ملی۔ جو مسجد جامع کے متصل تھا۔ ایک دن ہم اور ماموں صاحب
اور چند دوسرے حضرات غالب کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے۔
اثنائے کلام میں ایک صاحب نے میرے مذہب کو دریافت کیا۔
غالب نے میرے ماموں کی طرف اشارہ کرکے کہا مِنْهُم اور میری
جانب اشارہ کرکے کہا مِنّا۔ یعنی میرے ماموں کو کہا کہ سُنّی ہیں۔
اور مجھ کو کہا کہ یہ ہم میں سے ہیں یعنی شیعہ ہیں۔"

دیکھیے حافظ شیرازی کی نسبت کیسا جھگڑا پڑا ہوا ہے۔ شیعی کہتے ہیں شیعہ تھے۔ اور
اُن کا قصیدہ اس کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔ اہل سنت انھیں سُنّی کہتے ہیں،
اور قصیدہ کو الحاقی بتاتے ہیں۔

محقق دوانی کی نسبت بھی یہی جھگڑا ہے۔ شیعہ اُن کی نسبت کہتے ہیں کہ آخر زمانہ
میں وہ شیعہ ہوگئے تھے۔ اور رسالۂ نور الہدایہ علامہ دوانی کو حجت میں پیش کرتے
ہیں۔ غرضکہ اگر مذہب بہ تحقیق کرکے لکھا جاتا تو آج اُن لوگوں میں اس قسم کا
جھگڑا پیدا نہ ہو۔

بہرحال جناب رشید کا مذہب شیعہ تھا۔ لیکن تعصب مذہبی اُن کو مطلق
نہ تھا۔ اُن کے تمام مراثی اس امر کے ثبوت کے لیے کافی ہیں۔ سُنّی و شیعہ کے مابہ النزاع
مسائل کا اُن کے کسی صنف کے کلام میں ذرا ذکر نہیں۔ حیدرآباد۔ پٹنہ۔ کلکتہ اور
لکھنؤ کی مجالس میں ایک معتد بہ تعداد اہل سنت کی ہوتی تھی۔ مگر کبھی کسی نے مرثیہ کے
کسی حصہ میں کوئی مقام اپنے اعتقاد کے خلاف نہ پایا۔

ظاہر ہے کہ صنفِ سخن میں مرثیہ وہ صنف ہے جس میں سوائے حالاتِ متعلقہ کے کسی دوسرے مضمون کی گنجائش ہی نہیں۔ قادر الکلامی کے تو یہی معنی ہیں کہ شاعر جس صنف کو اختیار کرے۔ اُس کے دائرے سے آگے قدم نہ نکالے۔

مرثیہ کا میدان اوّل تو یوں ہی وسیع ہے۔ دوسرے یہ کہ فضائل و حالاتِ شہدائے کربلا اس قدر وسیع ہیں کہ آج تک لکھے جاتے ہیں۔ اور ختم نہیں ہوتے۔

اسی طرح انیس و دبیر نے بھی مذہبی مسائل سے اپنے مراثی میں گریز کی ہے چنانچہ ایک مرتبہ ماہِ رمضان میں مکرمی جناب نواب بہن صاحب بلیغ کے مکان پر وقتِ افطار میں بھی موجود تھا۔ ایک صاحب ضعیف العمر مرزا احمد بخش صاحب بھی موجود تھے جو مرزا دبیر مغفور کے شاگرد ہیں اور جن کے پاس اُن مرحوم کے کلام کا بیشتر حصہ موجود ہے۔ اثنائے کلام میں مرزا دبیر مغفور کا ذکر نکل آیا۔ اور اتفاق سے مرثیہ کے اس طرز پر گفتگو ہونے لگی جس سے کسی گروہ کی دلشکنی ہو۔ مرزا صاحب موصوف نے بیان کیا۔ کہ پٹنہ میں ایک دفعہ دبیر مغفور سے لوگوں نے اصرار کیا۔ کہ کچھ رباعیات خلافِ شانِ مرثیہ نظم کریں اور پڑھیں۔ اول تو مرزا صاحب نے بہت انکار کیا۔ مگر جب لوگوں نے نہ مانا تو ناچار دو رباعیاں کہیں۔ جن کے چوتھے مصرعہ میں نعمت خاں عالی کے دو قطعوں کے آخری مصرعوں کا بعینہٖ ترجمہ کر دیا ہے۔

مشہور ہے کہ عالمگیر کے بارہا استفسارِ مذہب پر نعمت خاں عالی نے جواب پیچیدہ دیا تھا۔ اُن قطعات کے مطلب میں دو پہلو ہیں۔ اگر چار کی تکرار کو متعدد در دیا جائے تو مذہبِ سنّی کی پیروی معلوم ہوتی ہے۔ اگر چار کو تین سے ضرب دے کے جمع کریں تو مذہبِ اثنا عشری کا ماننا ثابت ہوتا ہے۔ ذیل میں عالی اور دبیر دونوں کے

اشعار پیش کش ہیں۔

غالی

بار ہا گفتم ہوا سے شہریار	چار یارم۔ چار یارم۔ چار یار

مرزا دبیر

گو قائل چار یار اغیار ہوئے	ہم اُن کے شریک چار و ناچار ہوئے
پوچھیں جو نبی کے جانشینوں کو دبیر	کہہ چار ہوئے چار ہو چار ہوئے

غالی

اصحاب نبی کہ چار یار اند	چوں چار کتاب در شمار اند
دریا کی شان شکے نہ رہے	زاں چار یکے نداشت عیبے

دبیر

افضل ہیں نبی کے یار سب یاروں میں	چیدہ ہیں یہ یار لاکھ دیں داروں میں
کچھ اس میں شک نہیں ہم کو دبیر	اک دل اسے ڈھونڈا نہیں ان چاروں میں

یہ رباعیاں مثالاً اس وجہ سے لکھ دی گئیں کہ ان میں کوئی امر خلاف مذہب نہیں ہے جو کسی کو ناگوار گذرے۔ چونکہ اس میں رکھا گیا ہے وہ ظاہر ہے۔ اور دونوں مذہب اثنا عشری کے عقائد کو جاسق ہے۔ بہرحال رباعیات پُرلطف ہیں بہ حیثیت کلام۔

طرز تحریر — رشید کی گفتگو کا طریقہ نہایت دلچسپ تھا۔ اول تو اُن کی سلیس زبان دوسرے نرم لہجہ۔ یہ دونو باتیں ایسی تھیں جو سننے والے کو محو کر دیتی تھیں جواب نہایت نرم اور مختصر الفاظ میں دیتے تھے۔ جب لوگ مولوی صاحب بہ شاد ان سے اُن کے حالات قلمبند کرنا شروع کیے تو دوسرے تیسرے روز کا سب ترتیب دیا کرتے تھے اور خود جناب رشید یا جناب حمید سے استفسار حالات کرتے تھے۔ ایک مرتبہ

مولوی صاحب موصوف نے جناب رشید سے اُن کے کلام کے انتخاب کے بارہ میں گفتگو چھیڑ دی۔ اور کہا کہ فلاں مرثیہ دیجیے۔ اور فلاں سلام دیجیے اور ہاں وہ رباعیات بھی مرحمت فرمایئے جو حضور نظام کی مدح میں ہیں۔ اور دیکھیے اپنی رباعی کا مجموعہ بھی نکال رکھیے گا۔ مجموعے گا نہیں۔ جناب رشید نے ان سب باتوں کا جواب اس مختصر جملہ سے دیا "بھئی میں اپنا بستہ لا کے دیتا ہوں۔ تم لیتے جاؤ جو جی چاہے نکال لینا" لفظ "بھئی" تو اُن کی زبان سے ایسی پیاری معلوم ہوتی تھی کہ گویا انھیں کے لیے وضع ہوئی تھی۔ سر مجلس بھی جس بند پر سامعین کی زیادہ توجہ پاتے تھے تو کہتے تھے "بھئی سنو" اور کبھی کبھی کسی مصرعہ کے پہلے اس کو استعمال کرتے تھے۔ تو معلوم ہوتا تھا کہ جزو مصرعہ ہی ہے۔

لطیفہ

شدید گرمیوں میں ایک مرتبہ جناب محشر ملنے گئے۔ باتیں ہونے لگیں۔ اثنائے گفتگو میں مرحوم نے عرق پیشانی رومال سے پاک کیا اور مسکرا کر فرمایا "محشر! دیکھتے کیا ہو پسینہ نہیں ہے دماغ سے مضامین کا جوہر کھنچ رہا ہے، پسینہ نہیں رومال میں اس وقت جتنا مادہ سمٹا ہے۔ اس کا تو سب ضرور نظم ہوگی دیکھ لینا"

اگر کسی کو خط لکھتے تھے تو جب مختصر اور مطلب کا جزو

خودداری | جہاں یہ سب تھا وہاں رشید میں صفت خودداری بھی بہت تھی۔ زیادہ خودنمائی اگرچہ کسی حد تک ہو اور وہ صحیح ہی کیوں نہ ہو۔ دوسروں کی نظروں میں زوال وقعت کا باعث ہو جایا کرتی ہے۔ واضعان قانون تمدن و اخلاق نے جو

اصول تہذیب مجلس کی صحت میں قائم کیے ہیں ۔ اُن کی پابندی اگر کچھ اور نہیں تو انسان کو
خود شناسی اور غیر شناسی کے سچے راستہ پر ڈال دیتی ہے ۔ مگر یہ نتیجہ اُس وقت نکلتا ہے
جب اصول تہذیب مجلس کی پابندی میں رسم زمانہ یا دکھاوٹ کا شائبہ مطلق نہ ہو
کیونکہ جہاں غرضِ اصلی مفقود ہوگی ۔ پابندی تہذیب مضحک ہو جائے گی ۔ اور جہاں
مدعائے حقیقی مدِ نظر ہوگا ۔ روح کو فرحت حاصل ہوگی

جو اصحاب ان اصولوں کے منشاء اصلی سے بیگانہ ہیں وہ اُن کو محض تکلف
سمجھ کے ہنستے ہیں ۔ مگر وہ حضرات شاید یہ نہیں سوچتے ۔ کہ اگر اس تکلف کو درمیان
سے نکال دیا جائے تو جو افراد مستحق عزت ہیں اور جو نہیں ہیں وہ دونوں ایک ہی
سطح پر آ جاتے ہیں ۔ اور جس کا آخری نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ صلحاء جہلا امرا و فقرا
سب ایک ہی برتاؤ کے قابل ہیں ۔ مگر ایسا نہیں ہے ۔ میں اس بحث کو طولانی کرنے
میں مطلب سے دور نکل جاؤں گا لہذا یہ کہہ کے ختم کرتا ہوں کہ اصولِ تہذیب کی
پابندی ہر مہذب قوم میں اس کے رہنماؤں کی سچی پیروی ہے ۔

اے یورپ کی تہذیب کے دلدادہ نوجوانو اپنے آباؤ اجداد کے اوضاع پر
پہلے ایک نظر ڈال لو پھر جو جی چاہے کر دو ! ◆

حاضر جوابی | رشید چونکہ زبان دراز تھی بالکل ختم) ۔ اس وجہ سے جو جملہ منہ سے
نکلتا تھا ۔ مناسب محل ہوتا تھا ۔ ایک دفعہ ایک صاحب دولت رشید کے
پاس تشریف لائے ۔ چونکہ خود بھی شاعر تھے ۔ ایک مطلا بیاض ایک مصاحب
ساتھ تھی ۔ اُن کی تشریف آوری کی غرض رشید کو اپنا کلام سنانا تھا اور سب
بعد رسم ملاقات اُن حضرت نے اجازت رشید سے کے بیاض کھولی ۔

رشید سننے کے لیے متوجہ ہوئے۔ بیچارہ کی زبان سے پورا مصرعہ بھی نہ نکلنے پایا تھا کہ مصاحبین نے جو اُن کے ہمراہ تھے اہا۔ ہا۔ ہا سبحان اللہ کی صدائیں بلند کرنی شروع کردیں۔ اسی طرح وہ حضرت چار پانچ شعر پڑھ گئے۔ رشید صرف گردن ہلاتے رہے مگر ان کی خاموشی کی اُن کو تاب نہ رہی اور کہا۔ جناب آپ کچھ نہیں بولتے۔ فرمایا: "حضرت جہاں تعریف کرنے والے موجود ہوں وہاں رشید کے بولنے کا کیا محل"۔ اس پر سب خاموش ہوگئے اور اب رشید نے اُن کے کلام کی برمحل داد دینا شروع کی وہ حضرت بہت خوش ہوئے اور بیاض رشید کے پاس اصلاح کی غرض سے چھوڑ گئے

رشید اور آلا اودل

رشید کے مکان کی پشت پر ایک وسیع زمین پڑی ہے جس پر کاشت ہوتی ہے۔ اور چند مکان بنے ہیں۔ جن میں مزدوری پیشہ قومیں آباد ہیں۔ لوگ دن بھر کے تھکے ماندے رات کے وقت اپنے اپنے جھونپڑوں میں بے فکری سے اوقات گزاری کرتے ہیں۔ اور اُن کی دوسری دلچسپی کے اشغال میں ایک آلا اودل کا پڑھا جانا بھی ہے۔ چنانچہ حمید مرحوم کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ ادھر آلا اودل شروع ہوئی اور جناب رشید کھیت کی مینڈھ پر جا بیٹھے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ رات کے دو بجے اُٹھ کر گھر آئے۔ رشید کو اس سے غیر معمولی دلچسپی کی وجہ یہ تھی کہ یہ ہندی کی نظم رزمیہ ہے اور اس قدر سادہ ہے کہ یورپ کی نیچرل شاعری کا جواب دیتی ہے چونکہ رشید کو مرثیوں میں رزمیہ کلام برتنا تھا۔ اس وجہ سے آلا اودل کی واقعہ نگاری اور سادگی بہت پسند آتی تھی۔ اور اس کی بہت تعریف کرتے تھے۔

دو مصرعے

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ رشید لکھنؤ میں کہیں مرثیہ پڑھنے جا رہے تھے سکرم کی سواری تھی۔ اتفاق سے سکرم کسی دوسری گاڑی سے لڑ گئی اور گھوڑے بگڑ گئے

بیچارہ اس قدر خائف ہوئے۔ کہ دعائے خوف پڑھنے لگے۔ خدا خدا کرکے جانور دھیمے ہوئے اور رشید کو مقام مقررہ پر پہنچا دیا۔ اُس روز سے آخری دم تک پھر کبھی شکرم پر نہیں بیٹھے پالکی میں جایا کرتے تھے +

بجلی اور رشید | بجلی سے بہت ڈرتے تھے جب آسمان پر تصادم ابر و باد ہوتا تھا۔ وہ باہر نظر نہ آتے تھے۔ ذرا بھی اگر کوندے کی لپک کے آثار نمایاں ہوئے۔ رشید گھر کے آخری کونے میں جا چھپتے تھے۔ اور رضائی اوڑھ لیتے تھے۔ اگر کہیں متواتر گڑگڑاہٹ شروع ہو جاتی تھی تو بس پھر غضب کا سماں تھا۔ کانوں کو ہاتھوں سے بند کر لیتے تھے اور جب تک فضائی فرشتوں کی شورش برطرف نہ ہوتی تھی۔ اُس وقت تک وہ گوشہ ہوتا تھا اور رشید +

تکالیف کا اندازہ انسان کو اُس وقت تک نہیں ہوتا جب تک خود مبتلا نہ ہو یا کسی دوسرے کو اُن کے شکنجہ میں عبرت کی نگاہ سے نہ دیکھ لے سُنا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ رشید نے کسی برق زدہ شخص کو دیکھ لیا تھا جو کہ بحیثیت شاعر سریع الحس قلب پایا تھا۔ اس لیے جب بجلی چمکتی تھی۔ اُن کو اس سلسلہ میں وہی واقعہ یاد آجاتا تھا +

استغنا | ایک صاحب فیض آباد میں بالکل غریب آدمی تھے وہ جناب رشید کو اپنے یہاں مجالس پڑھوانے کے لیے لے گئے۔ تین مجلسیں انھوں نے پڑھیں۔ وہ بیچارہ مصارف سفر کہیں سے فراہم کرکے رشید کو دینے لگے رشید نے قطعاً انکار کیا۔ دو سال تک اپنے ہی مصارف سے گئے۔ تیسری سال جب اُنھوں نے بہت ہی مجبور کیا۔ اور ٹکٹ ہی لا کر دے دیا۔ تو رشید نے مجبوراً منظور کیا +

ضلع مظفر نگر میں کھتولی ایک مقام ہے وہاں کے ایک باشندہ سید حافظ علی صاحب

لکھنؤ آئے۔ اور جناب رشید کو اپنے ساتھ لے گئے۔ سید صاحب بارہے کے ایک پُر جوش شیعہ تھے۔ مگر دولت نہ رکھتے تھے۔ رشید کو پڑھوانے کا شوق تھا محرم کا زمانہ تھا۔ رشید نے چار مجلسیں پڑھیں۔ تمام گرد و نواح کے سادات بارہہ جمع ہوتے تھے۔ اور اس مدّاح خاندان رسالت کو سچی داد دیتے تھے۔

جب مجلسیں ختم ہوئیں صاحب مجلس نے ایک سو تیس ۱۳۰ روپیہ صرف مصارف آمد و رفت کی حیثیت سے پیش کیے۔ رشید نہیں لیتے تھے۔ مگر انھوں نے باصرار دے ہی دیے۔ رشید کو یہ اصرار ناگوار ہوا۔ اور کئی سال تک نہیں گئے۔ مگر سید صاحب آخر کار اس قدر مصر ہوئے کہ ایک مرتبہ کہنے لگے۔ اگر آپ اب تشریف نہ لائیں گے تو امام حسینؑ سے فریاد کروں گا۔ رشید پھر جانے لگے۔ اور صرف مصارف سفر لے لیتے تھے۔ اور بس +

مرثیہ اور غزل

انیس کے زمانہ سے کچھ قبل تک "بگڑا ہوا شاعر مرثیہ گو" کہا جاتا تھا۔ مگر انیس نے اس کی تردید کر دی۔ اور ثابت کر دکھایا کہ لوگوں کا خیال غلط ہے۔ انھوں نے مرثیہ گوئی کو اس قدر وسعت دی کہ اس صنف کے مجدد کہلائے۔ چنانچہ ایک سلام میں بجا فخر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ؎

مری قدر کر اے زمین سخن　　تجھے بات میں آسماں کر دیا

غزل کے جو مضامین ہیں کہ وصال۔ ہجر۔ اُمید۔ یاس۔ حسرت وغیرہ کے مضامین ایسے مخصوص قافیہ و ردیف میں کہے جاتے ہیں۔ بلکہ یہی مضامین کسی دوسری صنف سخن میں کہے جا سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ان کے نظم کرنے والے میں پوری قدرت ہو کہ انھیں دوسرے لباس میں آراستہ کر سکے۔ میں اپنے قول کی تائید میں مولانا شوری مرحوم کا

"مشرقی شاعری" تالیف کا شکر گزار ہوں جس میں انھوں نے۔ انیس کے کلام تغزل آمیز کو ان کے مذہبی کلام مرثیہ، سلام، وغیرہ سے نکال کے جمع کیا ہے۔

انیس کی غزل

رشید کے نانا میر انیس نے دوران مرثیہ گوئی میں غزل گوئی کا کبھی اظہار نہیں کیا۔ اگرچہ یہ شغل بھی ہر صنف سخن کے مشاق کے لیے ناگزیر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ابتدا میں غزلیں بھی کہیں اور بہت کہیں، جن کا مجموعہ ان کے خاندان میں موجود ہے یہ اشعار انھیں کے ہیں۔

ہوا ہے ایسا ہی ساقی ہر ایک ہے — مگر تو ہی نہیں یا قسمت ہمارا ہے کم
لکھ کر زمیں پہ نام ہمارا مٹا دیا — ان کا تو کھیل خاک میں ہم کو ملا دیا
دل لے لیا ہے یا پسنے مخفی ہیں جابجا — کھلتا نہیں پسند ہے یا ناپسند ہے

لیکن جب سے مرثیہ گوئی میں زیادہ انہماک ہوا اُس وقت سے مشق غزل بالکل ترک کر دی تھی۔ جناب رشید فرماتے تھے کہ لکھنؤ میں ایک مرتبہ مشاعرہ منعقد ہوا۔ میرا عنفوان شباب تھا۔ اور مشق سخن کی ابتدا تھی۔ میں نے غزل کہی اور نانا صاحب کے پاس اصلاح کو لے گیا۔ مصرع طرح یہ تھا۔

وصل کی شب ان سے باتوں میں سحر ہو جائے گی،

انیس کی طبع غزل

اُس وقت نانا صاحب قبلہ کو میں نے حسب معمول خوش مزاج پا کے ان کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ اور عرض کی کہ آپ بھی اس طرح میں غزل کہیے۔ میری اس عرض پہ مسکرائے اور گلے سے لگا کے کہا بیٹا مرثیہ گوئی نے ہماری غزل گوئی کھو دی ہے اچھا ایک دفعہ مجلس میں تمہاری خوشی کریں گے اور غزل پڑھیں گے۔

تھوڑے دنوں کے بعد انیس کے نئے مرثیہ کا ردیف آ گیا۔ دل آرام کی

بارہ دری میں گھنٹوں قبل مجمع ہو گیا۔ بعد انتظار انیس تشریف لائے۔ اور رونق افروز ممبر ہوئے۔ زیر ممبر نفیس دولت کے ہمراہ رشید بھی بیٹھے تھے۔ انیس نے دو رباعیاں پڑھنے کے بعد فرمایا "پیارے ہماری غزل سنو" اور یہ کہہ کے سلام شروع کیا۔ جس کا یہ ایک شعر ہے

کہتے تھے سرور علی اکبر کا مرنا ہائے ہائے کیا غضب ہوگا جو صغرا کو خبر ہو جائے گی

یہ پورا سلام اس قدر [illegible] تھا کہ چاروں طرف سے گریہ کی صدائیں بلند ہو گئیں۔

معلوم ہوا کہ انیس کا ملکۂ خداداد مرثیہ گوئی میں کسی صنف سخن کا محتاج نہ تھا۔ مرثیہ ان کے لیے بنا تھا اور وہ مرثیہ کے لیے۔

غزل کا اسلوب

حقیقت یہ ہے کہ یہی غزل کے دو مصرعے اکثر ذہین شاعر کی بنیاد کے لیے دو سنگین ستونوں کا کام دیتے ہیں۔ اگر ان کو پہلے مضبوط کر کے شاعری کے دوسرے دشوار گذار راستوں میں قدم بڑھایا جائے تو منزل مقصود تک پہنچنا سہل ہے۔ وجہ یہ ہے کہ غزل جس کا نام ہے اس کا دائرہ بہت وسیع ہے اور ساتھ ہی ساتھ مشکل بھی اس طرح ہر شعر خیال کی ایک اور ایک سی تصویر پیش کرنے کی قابلیت رکھتا ہے جس کو ایک سنجیدہ فنکار ہی خوب بیان کر سکتا ہے یا وہ شخص جس کی نگاہوں کے سامنے مناسبت و یکجائی کا تماشا ہر وقت موجود ہو۔

جب ایک شعر اس طرح مکمل ہو جاتا ہے تو اس شاعر کا خیال دوسرے مضمون کو اٹھاتا ہے۔ اور اسمیں مستغرق ہو جاتا ہے۔ اسلئے کبھی یہ دونوں حال میں کسی دوسرے مضمون کو دماغ میں چھیڑ دینا پہلے خیال کی تکمیل میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔

غزل کے علاوہ دوسرے اصناف سخن کے لیے کم و بیش تسلسل کی سخت ضرورت ہے
مثلاً قصیدہ۔ مثنوی۔ مرثیہ وغیرہا ہیں۔ رہا غزل کا مذاق سلیم کی حدوں میں رہا کسی بہتر
بلکہ وہی ہی ہے۔ بہرحال ایک شعر جس کو شعر کہہ سکتے ہیں اپنی خاص طرز میں سچا اور سہل ہو سکتے ہیں
فکر نقاد دونوں کا فرق خوب سمجھ سکتی ہے۔ لہذا مثال دینا یا موازنہ کرنا تحصیل حاصل ہے۔

رشید کا سلسلہ تلمذ

رشید اول تو ایسے طبقہ میں پیدا ہوئے تھے کہ شاعری جن کی میراث تھی
لطف یہ کہ ننہال کے افراد مرثیہ گوئی میں طاق۔ ددھیال کے غزل گوئی میں شہرۂ
آفاق۔ ان کا وجود ایک ایسا نونہال تھا جس کو گلستان سخن کی دو ہواؤں نے
پرورش کیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے سخن کی دونوں صنفوں سے بہرۂ
کامل حاصل کیا۔ اور دونوں خاندانوں کے کمال کو زندہ رکھا۔

رشید اپنے نانا کی حیات میں سن تمیز کو پہنچ چکے تھے۔ اور ان کے کمال کے
مظاہروں سے سبق حاصل کرتے رہتے تھے۔ اکثر غزلیں میر انیس کو دکھائیں۔ مگر زیادہ تر
عشق مرحوم کو۔ چنانچہ اس مرثیہ میں جس کا مطلع یہ ہے۔

میں ہوں سلطان سخن مجھ سے بڑھی شان سخن،

علاوہ دوسرے تعلقات کے شاگردی عشق کی طرف بھی اشارہ ہے۔

میں بھی ہوں وارث طرز سخن میر انیس
مونس خلق ہوں ہیں میری زباں پہ جو سلیس
ہوں تعشق کے سبب کاشف معنی نفیس
ایک ہی باغ کے دو پھول ہیں انیس و نفیس

خوب تحقیق ہیں بچپن سے رہی کہ مجھ کو
مستند ہوں کہ ملی عشق کی مسند مجھ کو

رشید کی غزل پر زیادہ تر سید صاحب تعشق مغفور کے طرز خیال کا

پورا پورا پرتو نظر آتا ہے۔ حالانکہ ابتداءً اُن سے رشید کو شرفِ تلمذ حاصل نہ تھا ہاں جناب سید باقر صاحب حمید مرحوم اُن کے ساختہ پرداختہ تھے۔ معلوم ہوا کہ رشید کی طبیعت میں فطرت نے مذاقِ سلیم کا سرمایہ پہلے ہی سے ودیعت کر دیا تھا۔ جس پر صرف معمولی صیقل درکار تھی۔ جو تعشق مرحوم کی صحبت سے حاصل ہوئی۔ مگر عشق مرحوم کے بعد رشید تعشق ہی سے اصلاح لینے لگے۔

رشید کا شعر

رشید کے تمام کلام پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وقتِ نظم اُن کی پہلی کوشش صفائے بندش۔ روانی۔ اور لطافتِ محاورہ میں صرف ہوتی تھی۔ اُس کے بعد درستیٔ خیال چُستیٔ مضامین کی طرف توجہ مبذول کرتے تھے۔ چنانچہ اُن کے کلام میں بعض اوقات ایسی مثالیں بھی پائی جاتی ہیں جن میں محض زبان کی خاطر جد و جہد نے مضامین کو بالکل سادہ کر دیا ہے۔ نظم میں اچھی زبان۔ یا خرم زبان ہونے کے یہ معنی کبھی نہیں۔ کہ خوبیٔ مضامین ہاتھ سے جاتی رہی۔ بلکہ ایک زبان کہنے والے شاعر کو دونوں پہلوؤں پر برابر کی نظر ڈالنی چاہیے۔ جس کی کوئی دوسری مثال سوائے انیس کے نہیں پاتی۔ نرم گرم پہلو ... کہ جہاں پائے جاتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا۔ کہ رشید اس نکتہ سے مبرا ہیں۔ مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ اگرچہ بعض مقامات پر اُن کے ہاں شعر بالکل سادہ نظر آتا ہے۔ مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ خوبی ضرور پائی جاتی ہے۔ لیکن جہاں زبان و مضامین دونوں کو کامیابی ہو جاتی ہے۔ اُس کا کیا کہنا۔ چنانچہ ایک مطلع فرماتے ہیں۔

خاکِ حسرت لے گئے دل لٹ کے ویراں کر گئے — آپ کے دیوانے ساتھ اپنے بیاباں لے گئے

دوسرے مصرعہ میں جس حسن سے محاورہ صرف ہوا ہے۔ اُس کا جواب نہیں۔

تغزل | رشید غزل اردو زبان میں کہتے تھے۔ جس میں معاملہ بندی کا عنصر قوی۔ عاشقانہ مضامین بشیر غزل میں شوخی اسی قدر ہوتی ہے جہاں تک وہ مذاق سلیم کی حدود میں رہے۔ اور مبتذل نہ ہو جائے۔ اور یہی مشکل ہے۔ مرحوم نے سلاست و اثر کو اپنے کلام میں اس قدر جگہ دی ہے کہ ایک معاملہ گو شاعر سے اتنی اُمید نہیں ہو سکتی۔

خلاصہ یہ کہ رشید جو کچھ کہا پڑھتے ہیں۔ صفائے بندش۔ سلاست بیان اس پہ کچھ اور اضافہ کرکے پیش کرتے ہیں۔ کوئی مضمون غیر مانوس ترکیبوں سے دبا ہوا نہیں پاتا۔ اور حقیقت میں شاعری اسی کا نام ہے۔ مضامین عالیہ کو الفاظ کے قالب میں بند کرنا ہر شاعر کا کام نہیں۔ بہت بڑا ہے۔ پیچ اور بانکپن ہے۔ خیر جو رنگ جس کو پسند ہو وہی بہتر۔ جس زمانہ میں ہندوستان جدید تمدن کی ایک منزل اور طے کر چکے گا اور فن تنقید کو رواج ہوگا۔ اس وقت عوام اس کا صحیح اندازہ کر سکیں گے۔

میرے متعلق رشید کی رائے | میں رشید کے مذاق شعر کا ذکر کر رہا ہوں اور اسی سلسلہ میں ایک فصل پیش کرتا ہوں جناب محشر لکھنوی کی

نقل

ایک دن دربار رشید کی خدمت میں حاضر ہوا۔ باتیں کرتے کرتے مجھ سے فرمایا "دیکھیں محشر! شاعر کو کیا کرنا چاہیے؟" میں نے عرض کی "امکان جذبات اصلی نظم کرنے کی قوت ہونی چاہیے" فرمایا "اس کے ساتھ اتنا اور بڑھا دو۔ کہ سیدھی زبان میں"

نوٹ

واقعی عربی اور فارسی کی سنگین ترکیبوں اور لفظوں کا بوجھ غزل نہیں اُٹھا سکتی۔

رشید اپنے شاگردوں سے اکثر فرمایا کرتے تھے۔ کہ تکمیل کلام اُسی وقت ہوتی ہے جب مناسب الفاظ بر محل نظم بھی ہو جائے۔ اگر کسی شاگرد کی غزل میں کسی جگہ کوئی ثقیل لفظ ہوتی تھی تو اُس کو ایسے عمدہ الفاظ سے بدل دیتے تھے کہ مطلب ہاتھ سے نہیں جانے پاتا تھا۔ بلکہ اور شعر میں ترقی ہو جاتی تھی۔ چنانچہ ایک روز ایک شاگرد نے غزل پیش کی جس کا مطلع یہ تھا۔ ؎

دلِ مجروح پہ احسان تمہارا ہوتا　　　اور اک تیر اگر زخم پہ مارا ہوتا

دوسرے مصرعہ میں بجائے "زخم پہ" کے "پاس سے" بنا دیا۔ اب شعر کو پڑھیے تو سلاست و ترقی لفظ کا اندازہ ہو۔ حاصل کلام یہ کہ وہ خود بھی دلدادۂ زبان تھے۔ اور دوسروں سے بھی یہی اُمید رکھتے تھے۔ چنانچہ میں اپنے قول کی تائید میں جناب عزیز لکھنوی کا ایک خط درج کرتا ہوں۔ وھو ھذا

"زمانہ کا رنگ ہر چیز میں جاری و ساری ہے اور اس سے زبان بھی مستثنیٰ نہیں رشید کے عہد میں زبان اردو میں ایک عظیم انقلاب پیدا ہوا۔ کچھ تو بضرورت اور کچھ اخبارات و رسائل اور جدید تعلیم یافتہ حضرات کی دریا دلی اور فیاضی سے خصوصاً پنجاب سے یہ گھٹائیں اُٹھیں۔ اور ناواقفان زبان پر چھا گئیں مگر رشید اپنے اصلی مرکز پر قائم رہے اور اُردو کی اصلی عظمت کو نظر انداز نہیں کیا۔

رشید کی غزل میں غلو نہیں ہوتا تھا۔ صاف صاف شعر کہتے تھے۔ مگر رنگ و اثر کا علم تقریباً ہر شعر پر ہوتا تھا۔ تخئیل میں ندرت کم ہوتی تھی مگر سلاست و تاثیر کے دریا بہتے تھے۔ اور اس میں شک نہیں کہ ان کا کلام

زبان کا ہنر بن چکا ہو۔ تو الی احاطات، و تراکیب فارسی سے ان کو انس نہ تھا۔ میں نے علیہ کی صحبت میں ان کو ایک غزل ایسی سنائی۔

شرح جنون سلسلۂ خوباں کیے ہوئے
بیٹھا ہوں چاک چاک گریباں کیے ہوئے

مطلع سن کر کہنے لگے "بھائی پہلا مصرعہ بالکل فارسی ہوگیا" اور اشعار کی داد دی جس کا ذکر میرے لیے مناسب نہیں۔ مادار ۴۴ میں میر نواب علی صاحب کے مکان پر ایک قصیدہ خوانی کی صحبت تھی اُس میں حضرت رشید و جدید بھی تھے۔ میں نے قصیدہ پڑھا

شب ہوئی انجم تابندہ کا لشکر نکلا
پیہم صبح لیے ماہ منور نکلا

اس قصیدہ میں جو اشعار زبان کا مطلع لیے ہوئے تھے اُس کی داد حضرت رشید نے خاص طور پر دی۔

اس سے مقصود اپنی تعریف نہیں بلکہ یہ دکھانا ہے کہ نظم میں ان کا تمام تر خیال صرف زبان پر رہتا ہے اسکا التزام وہ خود بھی کرتے تھے!! اور دوسروں کو بھی ہدایت کرتے تھے "

حاشیہ شرح حب ذیل رقمطراز ہیں۔

ایک روز جناب رشید کی خدمت میں سہ پہر کو حاضر ہوا گرمیوں کا زمانہ تھا مسجد کے حوض میں بہار ہے تھے مجھے دیکھکر بے اختیار فرمایا بھئی محشر ابھی ابھی یہ شعر کہا ہے سنو سبحان اللہ۔ یہ مطلع پڑھا۔

طاقت آئی مگر اعضا میں نہ گویا آئی	درد ہم آغوش مرے آئی تو پریشاں آئی

میں نے تعریف کر کے عرض کی کچھ اور [illegible] ہوئے تھوڑا تامل کر کے یوں عرض کر دو شعر کے بعد یہ شعر پڑھا۔

ابھی بجلی سی کبھی گر کے جو چمکے تو پوچھا	آج کیا شعلہ سوز یہ گورِ غریباں آئی

کرمی جناب مرزا امداد علی بیگ صاحب برادر جناب نواب نصیر الممالک میرزا شجاعت علی خاں بہادر - یہ واقعہ بیان فرماتے ہیں - کہ ایک مرتبہ ماہ ربیع الاول میں جب رشید مجالس پڑھنے کلکتہ تشریف لائے - نواب نصیر الممالک کے یہاں مجالس شروع ہوئیں - ایک مجلس کسی ایرانی ذاکر نے پڑھی چونکہ زبان فارسی تھی اس وجہ سے پورا مضمون مجلس عوام نہ سمجھے - مرثیہ اور [illegible] آیا رو سب گئے - بعد ختم مجالس لوگوں نے جناب رشید سے خواہش کی کہ اس روایت اور مضمون کو جو اس مجلس میں ذکر ہوئے تھے - مرثیہ کی صورت میں نظم کر کے سنا دیجئے جناب رشید خاموش رہے اور کچھ جواب نہ دیا - دوسرے روز جو منبر پر تشریف لے گئے - تو جس مرثیہ کا وہی مضمون تھا جو مجلس گذشتہ میں لوگوں نے فارسی میں سنا تھا سامعین کو حیرت ہوئی کہ رشید نے اس قدر جلد اور اس خوبی سے کیونکر وہ مضمون نظم کر لیا جسے آج تک حضرات کلکتہ رشید کو جب یاد کرتے ہیں تو اس واقعہ کو ان کے کمال کی سند میں پیش کرتے ہیں - بقول میر نواب صاحب مونس "ایک وقت میں سو پچاس بند مرثیہ کے کہہ لینا مشاقوں کے نزدیک کوئی بڑی بات نہیں -

ذیل کا واقعہ مرحوم کے [illegible] شاعری کے متعلق نقل کیا جاتا ہے -

نقل | ایک روز جناب رشید مرحوم بیٹھے ہوئے کچھ تصنیف کر رہے تھے -

میں پہونچ گیا۔ مجھ کو دیکھ کر بادامی کاغذ کے چھوٹے ٹکڑے سے چھپا لیے شروع کیے میں نے جسارت کرکے کہا کہ آپ کیا خراب کاغذ پر تصنیف فرماتے ہیں؟ جواب ملا۔ او بھائی یہ معشوقوں کے خط و خال۔ ناز و ادا۔ غمزہ و عشوہ کا ذکر نہیں جس کے لیے عمدہ اور نفیس کاغذ کی ضرورت ہو۔ بلکہ مصیبت زدوں کا مرثیہ ہے۔ اُس کے لیے مصیبت زدہ لباس۔ یعنی خستہ کاغذ ہونا چاہیے +

لطیفہ

جناب حکیم سید افضل علی صاحب عرف میرن صاحب جو رشید کے گہرے احباب میں ہیں۔ اُن کے بڑے صاحبزادہ صاحب عالم کی شادی حکیم صاحب موصوف کے بھائی کی دختر سے ہوئی۔ جلسۂ نکاح میں رشید بھی مدعو تھے جب عقد ہو چکا تو جناب رشید نے حکیم صاحب کی طرف مخاطب ہو کے فرمایا ؎

یہ آپس کی شادی بہت مجھ کو بھائی | یہ سمدھی کے سمدھی ہیں بھائی کے بھائی

اہل محفل اس برجستہ مزاج شاعرانہ سے بہت خوش ہوئے +

لکھنؤ کے مشاعرے اور رشید

آخر ستاون تک رشید مشاعروں میں بشوق شریک ہوتے تھے مگر جب مرثیہ گوئی کی طرف زیادہ توجہ ہوئی۔ مشاعروں کی شرکت کم کر دی تھی

قریب قریب تمام مرثیہ گویوں کا یہی اصول ہے کہ جب مرثیہ کی طرف زیادہ توجہ ہو جاتی ہے تو غزل گوئی سے دست بردار ہو جاتے ہیں۔

رشید نے گویا غزل گوئی ترک نہیں کی تھی۔ کیونکہ وہ فکر غزل کو مرثیہ میں اس خوبی سے صرف کرتے تھے کہ غزل کا لطف بھی آتا تھا۔

جس مشاعرہ میں کامل۔ ماہر مشتاق۔ جاوید۔ عارف۔ اوج ایسے کاملین فن

موجود ہوتے تھے وہاں رشید بھی ضرور رہتے تھے۔ یہ حضرات اپنی بہترین فکروں کے نمونے پیش کرتے تھے۔ اور خاطر خواہ دادِ سخن لیتے تھے۔ مگر زمانہ شاہد ہے کہ جب رشید مغفور کے سامنے کنول آتا تھا۔ تو بزمِ مشاعرہ میں ایک سناٹا سا چھا جاتا تھا۔ اور ان کی شاعری کا چراغ جلنے لگتا تھا۔ اور جب غزل پڑھتے تھے۔ اُس وقت کا سماں قابلِ دید ہوتا تھا۔ اُن کے بعد اول تو کوئی پڑھتا نہ تھا۔ اور اگر پڑھا بھی تو گویا رسمِ مشاعرہ کا ادا کرنا سمجھیے۔ اس مرجعیت کا سبب وہی اُن کی سادگی کلام اور جذبات نگاری تھی۔

فاخر مرحوم نے لکھنؤ میں ایسے ایسے مشاعرے کیے کہ زبان زدِ عوام ہیں جنابِ عشق مغفور اور جنابِ غضنفر علی خاں عرف بڑے کھیا صاحب حکیم کے مشاعروں کا ذکر بھی اکثر ہوتا ہے۔ آخری وقت میں خدنگِ نظر کے مشاعرے بھی غنیمت ہوئے ان مشاعروں کے بعد رشید نے گویا شرکتِ صحبتِ سخن بالکل ترک کر دی تھی نستی نوبت رائے صاحب نظر نے ادبیاتِ اردو کی بیش قدر خدمت کی ہے

ایک مرتبہ ۱۹۱۰ء میں جناب مرزا محمد ہادی صاحب عزیز نے مشاعرہ کیا طرح تھی

نقشِ فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا

یہ عظیم الشان مشاعرہ میر تقی میر علیہ الرحمہ کی "صد سالہ یادگار" میں قائم ہوا تھا پروفیسر مرزا رسوا نے اس بزم میں ادبیاتِ اردو کے متعلق ایک نہایت پُر زور تقریر کی تھی۔ لکھنؤ کے تمام سخن سنج۔ اور خوش گو حضرات جمع تھے۔ جنابِ رشید سے بھی وعدہ لیا گیا۔ اور مرحوم نے بپاسِ خاطرِ عزیز منظور کیا۔ لیکن مشاعرہ میں تشریف نہیں لائے۔ بلکہ دوسرے روز جنابِ عزیز سے خود ملنے آئے۔ اور عذرِ عدمِ شرکت یہ کیا۔ کہ اگر میں یہاں شریک ہوتا۔ تو دوسروں کو شکایت کا موقع مل جاتا۔ یہ کہہ کے چند اشعار

طرح میں سُنا ئے۔ اور واپس تشریف لے گئے۔

انجمن دائرہ | اراکین معیار کی طرف سے ایک انجمن موسوم بہ "انجمن دائرہ" قائم ہوئی تھی جناب رشید اُس کے پہلے جلسہ میں تشریف لے گئے تھے مگر اُس کے بعد پھر کبھی شریک نہ ہوئے رسالہ معیار کے ابتدائی دَور میں رشید کی متعدد غزلیں پائی جاتی ہیں۔ مگر یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔

جنابِ عزیز تحریر فرماتے ہیں کہ جس زمانہ میں معیار کے مشاعروں کی لکھنؤ میں دھوم تھی۔ اکثر تلامذہ طرح میں اُن سے غزلیں بنوالے جایا کرتے تھے۔ خود مشاعروں میں شرکت ترک کر دی تھی مگر کبھی کبھی طرح میں غزل یا سلام کہہ لیا کرتے تھے اور ہم لوگوں میں سے جب کوئی ملتا تھا تو کہتے تھے "بھائی تمہارے یہاں کی طرح میں۔ میں نے بھی کچھ کہا ہے" سلام ہوا تو ممبر پر سُنایا۔ غزل ہوئی تو آنے والے نے مکان پر سُنی +

مسئلہ تحفظ زبان | جہاں جہاں علوم کے مرکز ہیں وہاں کے حضرات علم ادب کی ترقی کے متعلق گاہے گاہے اپنی سرگرمیاں مختلف صورتوں میں ظاہر کرتے ہیں جن سے جلسوں میں وقتی چہل پہل ہو جاتی ہے اس سے بحث نہیں کہ وہ نتیجہ خیز ثابت ہوں یا نہیں۔ زمانہ جس رو میں بہہ جانا چاہتا ہے چلا جاتا ہے کسی کی تدبیر اُس کے خلاف کارگر نہیں ہوتی اسی طرح لکھنؤ میں بھی ایک مرتبہ تحفظ زبان کا مسئلہ درپیش ہوا۔ اُس وقت کے نامور ادیب اور شاعر غیر معمولی جوش کا اظہار کرنے لگے۔ ہر شخص بجائے خود اپنے کو تحفظِ زبان کا ذمہ دار سمجھنے لگا۔ پھر کیا تھا۔ جناب حامد علی خاں صاحب حامد بیرسٹر مرحوم کی تحریک سے نواب باقر علی خاں صاحب رئیس لکھنؤ (خلف نواب مہدی علی خاں صاحب مرحوم) نے اپنے وسیع مکان میں ایک بہت بڑا جلسہ منعقد کیا تاکہ مسئلہ مذکور کے متعلق علی بداپیرپ

غور کیا جائے۔

یہ جلسہ بالکل مغربی تہذیب کے مطابق تھا۔ شعرائے لکھنؤ میں حضرات جاوید، حمید، حامد، عزیز، اثر، وغیرہم شریک تھے +

رشید صدر مقرر ہوئے | جلسہ شروع ہوا۔ اور چند موقر حضرات کی تحریک و تائید سے حضرت رشید رئیس مجلس منتخب ہوئے۔ رشید کرسی صدارت پر بیٹھے غالباً اُن گوشہ گیر و عافیت پسند مرحوم کے لیے یہ پہلا موقع تھا۔ جناب حامد مغفور اور دیگر حضرات نے تحفظ زبان، کے متعلق تقریریں کیں۔ اور بالاتفاق یہ طے پایا کہ ایک "لغت خاص" لکھنؤ کے ارباب فن اور اہل زبان مرتب کریں بانی جلسہ نے اپنی عالی ہمتی سے اس کام کے لیے ایک رقم کثیر دینے کا وعدہ بھی فرمایا تھا۔ مگر انجام کیا ہوا؟ یہ نہ پوچھیے۔

حضرت رشید نے اُس جلسہ میں کچھ باتیں درمیان میں اور کچھ ختم صحبت پر فرمائی تھیں۔ جو نہایت دلچسپ اور کار آمد تھیں۔ ایک محل پر اصناف سخن کے متعلق فرمایا تھا: "غزل، قصیدہ، مثنوی۔ ان سب کی زبانیں الگ الگ ہیں"۔ جس کی شرح اہل زبان اور ماہرین فن بہت کچھ کر سکتے ہیں +

انتخاب پسند | خاندان انیس کے مشہور مرثیہ گو جناب میر علی محمد صاحب عارف مرحوم کی مجلس سوم میں جناب رشید تشریف لائے چہرہ اُترا ہوا۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے ہوئے پس ماندگان عارف سرشک آلود آنکھوں سے اس بزرگ خاندان کے اظہار تعزیت کو قبول کر رہے تھے۔ کہ یکایک رشید نے پُر درد لہجہ میں فرمایا۔
"افسوس خاندان انیس کا شیر اُٹھ گیا۔ یادرکھو عارف کا مثل نہ تھا۔ اب لکھنؤ کو قدر ہوگی کہ مرثیہ گوئی کیا چیز ہے۔ اور فن کس کا نام ہے"۔

مجھے اس وقت جناب حامد علی خاں صاحب بیرسٹر مرحوم کا شعر یاد آگیا جو انھوں نے گویا ایسے ہی مواقع کے لیے تصنیف کیا تھا۔ فرماتے ہیں ؎

یہ منزلت بھی غنیمت ہی اہلِ دُنیا کی ملا کے خاک میں ذکرِ کمال ہوتا ہی

ایک دوسرے موقعہ پر فقیر مؤلف اور چند دوسرے حضرات خدمتِ رشید میں حاضر تھے کہ ایک شاگرد نے ایک نظم اصلاح کے لیے پیش کی جو کسی جلسہ میں پڑھنے کے لیے کہی تھی۔ رشید نے اول سے آخر تک سارا نظم کو دیکھا۔ اور مجھ سے مخاطب ہو کے فرمایا "اس شہر قومی نظم کا کہنے والا اس وقت صفی سے بہتر کوئی نہیں"۔

تفاخرِ شاعرانہ دوسری چیز ہی۔ رشید میں خودنمائی اور خودستائی بالکل نہ تھی اُن کی نظروں میں ہر صاحبِ کمال کے کمال کا صحیح اندازہ تھا اور اُسی کی مناسبت سے عظمت بھی اہلِ فہم کے نزدیک انصاف پسندی بجائے خود ایک کمال ہی۔

میر کی شان
صداے سخن
میر تقی کا
انصاف

میر تقی میر نے اپنے معاصرین کا ایک مختصر تذکرہ فارسی میں لکھا ہی جو ابھی انجمن ترقی حیدرآباد کی طرف سے چھپا ہی۔ اُس میں قابلِ لحاظ یہ امر ہی کہ میر صاحب نے ہر شاعر کے کلام پر منصفانہ نظر ڈالی ہی۔ اور میرے خیال میں داد تذکرہ نویسی دی ہی۔ لیکن قابلِ صد تعریف یہ امر ہی کہ وہی سودا جو اُن کا مردِ میدان اور فنِ شاعری کا حریف تھا۔ اُس کی نسبت میر کے قلم نے ذرا لغزش نہیں کی اور جس انصاف کا وہ مستحق تھا۔ اُس سے کچھ زیادہ اُس کی مدح سرائی کی ہی۔ ذیل کی چند سطریں ملاحظہ ہوں۔

مرزا رفیع المتخلص بہ سودا کہ جوانے خوش خلق و خوش خو ست۔ گرم جوش یار باش شگفتہ روے۔ مولدِ او شاہ جہان آباد است۔ نوکری پیشہ۔ غزل و قصیدہ

وثنوی و قطعہ و مخمس و رباعی۔ ہمہ را خوب مے گوید۔ سرآمد شعرائے اودھ ہے۔ بہ ہندی بسیار خوش گو است ہر شعرش طرفہ لطف رستہ رستہ۔ درین بندی الفاظش گل معنی دستہ دستہ۔ ہر مصرعہ برجستہ اش را سرو آزاد بندہ پیش فکر عالیش فکر عالی شمرندہ۔ شاعر ریختہ۔ چنانچہ ملک الشعرائی ریختہ او را شاید قصیدہ در ہجو ہمت گفتہ بہ تضحیک روزگار۔ دوارا حد مقدور دراز صفحہا بہ کار بردہ از اتفاق طرح غزل باہم می افتد۔ از مغتنمات روزگار است حق تعالیٰ سلامتش دارد"

(اردو کرہ نمبر ۳۲)

رشید و شعرائے لکھنؤ | تمام شعرائے لکھنؤ رشید کو سند مانتے تھے۔ اور ان کے تصنیف کو بنظر قبول سے دیکھتے تھے۔ اگر کوئی رسالہ شعر و سخن کا جاری ہوتا تھا تو رشید کے کلام کو باعث زینت سمجھ کر ایک ممتاز جگہ چھاپتے تھے۔

لفظ "آبدست" مؤنث ہے | چنانچہ جب لفظ "آبدست" کے متعلق تذکیر و تانیث کا جھگڑا ہوا تو حکیم جلال مرحوم۔ اور دیگر نامی شعراء نے لکھا کہ آبدست مذکر ہے۔ اس وجہ سے کہ "آب" اور "دست" دونو مذکر ہیں لہذا دونوں کی ترکیبی صورت بھی مذکر ہونی چاہیے۔

جس وقت جناب رشید سے اس لفظ کے متعلق استفسار کیا گیا تو انھوں نے فرمایا "میں۔ اور میرا خاندان اس لفظ کو مؤنث بولتا ہے" اور مزید شہادت یہ دی کہ انیس مغفور بھی اس لفظ کو مؤنث بولتے تھے۔ رشید اس دور آخر میں ایسے خوش نصیب شاعر تھے جن کو ان کے معاصرین نے بھی مانا۔ یہ بات اس عہد حریت میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

رسالہ معیار کی ابتدا | نواب حامد علی خاں صاحب بیرسٹر مغفور نے جو ادب اردو کی خدمت کی ہے اس کی داد کون دے سکتا ہے۔ ع "خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں"

مرحوم نے "دستیار" ایک ادبی رسالہ کی بنا ڈالی۔ جس کی عجب انوکھی طرز تھی حصۂ نثر کے معاونین جو قابل ذکر ہیں یہ تھے۔ مولانا سید علی حیدر صاحب نظم طباطبائی۔ مولوی سید اولاد حسین صاحب شاداں بلگرامی۔ مولوی سید احمد صاحب ناطق لکھنوی منشی احمد علی صاحب شوق قدوائی۔ پروفیسر مرزا محمد ہادی صاحب رسوا۔

معاونین حصۂ نظم کے لکھنؤ کے خوش گو شعرا

مثلاً جناب صفی۔ جناب ثاقب۔ جناب عزیز۔ جناب محشر۔ جناب احسن۔ جناب آرزو جناب بلیغ۔ جناب ثروت۔ جناب بہار۔ جناب [illegible] جناب فاضل وصفی شیون وغیرہم اُس کے خاص ممبر تھے ہر ممبر کے مکان پر باری باری ماہوار مشاعرہ ہوتا تھا۔ پہلے مقررہ قوافی طبع آزمائی کے لیے دیے جاتے تھے۔ اور پھر ہر قافیہ کے تحت میں ہر ایک کا شعر [illegible] معیار پر لایا جاتا تھا۔ چند شعر معیار نمونۃً تحریر ہیں

مشاعرہ بمکان جناب محشر منعقدہ ۲۷ نومبر ۱۹۱۱ء

احسن۔ [illegible] ٭ [illegible] زندگی [illegible] گذر جانا
آرزو۔ اُدھر [illegible] ٭ یونہی اکثر ترے کوچہ میں ہم کو دن گذر جانا
بلیغ۔ [illegible] ہو جانا ٭ تجھے [illegible] اپنا زمانے سے گذر جانا
ثروت۔ نہیں ممکن ترے ناوک کو بھی دل چھوڑ کر جانا ٭ کہ ہے دشوار صحرائے محبت سے گذر جانا
بہار۔ [illegible] میرے [illegible] ہو مر جانا ٭ تمہارا دیر کرنا وقت وعدہ کا گذر جانا
شیون۔ ہزاروں کو یونہی دیکھا ادھر آنا اُدھر جانا ٭ مگر پھر بھی نہ اس دنیا کو ہم نے رہ گذر جانا
صفی۔ جب ایسی زندگانی ہو تو پھر بہتر ہو مر جانا ٭ کسی تکلیف کا حدِ تحمل سے گذر جانا
عزیز۔ یہاں تک مشتعل ہونا کہ آخر کار مر جانا ٭ قیامت ہو قیامت سر سے پانی کا گذر جانا

مختصر ۔ دیارِ عشق تک لازم ہے سب کو بے خطر جانا ۔ کہ سنتا ہوں آنکھیں بچھی ہیں ایک ایک منزل سے گذر جانا



اس صورت میں پڑھنے والا اچھی طرح تصفیہ کر سکتا تھا۔ کہ کس شاعر نے کونسا قافیہ اچھا کہا ہے۔ اوّل اوّل یہ رسالہ ہندوستان بھر میں شعرا کا منظورِ نظر رہا۔ لیکن امتدادِ زمانہ کے ساتھ جتنی آپس کی شکر رنجیاں بڑھتی گئیں۔ اُسی قدر اُس کی قبولیت میں کمی آتی گئی۔ علی محسن خاں صاحب آبر مرحوم مدیر معیار گو شعر و سخن کے سچے دلدادہ تھے۔ اور اُس کی خدمت کے لیے ہمیشہ کمربستہ رہتے تھے۔ لیکن معیار ایسے پرچہ کا وقار قائم رکھنا اُن کی استعداد سے باہر تھا۔ جب تک کہ قلمی امداد فراہم کرتے رہے۔ اُس وقت تک اُس کی قبولیت میں ضعف پیدا نہ ہوا۔ مگر یہ سلسلہ معاونین کا قائم نہ رہا۔ اُس وقت سے معیار میں ایسا ضعف پیدا ہوا کہ پیہم تنزل رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ حامد مغفور کی زندگی ہی میں بند ہو گیا۔ اور پھر دوستوں کی کوششیں اُس کے جاری کرنے میں ناکامیاب ہیں۔

معیار کیوں بند ہوا

میری رائے میں معیار کے بند ہونے کی زبردست وجہ یہ تھی کہ آبر مرحوم نے ایک مضمون کے لکھنے میں خود رائی سے کام لیا جس کا ناگوار نتیجہ یہ ہوا۔ کہ بہت سے وہ وقیع ممبر جو معیار کے سچے معین تھے کنارہ کش ہو گئے۔ اور پھر شریک نہ ہوسکے۔ اگرچہ اُن لوگوں نے جنابِ حامد مغفور کے اخلاقِ حسنہ اور وجاہتِ ذاتی کے اثر سے کھلم کھلا مخالفت نہ کی۔ مگر دلوں میں غبار باقی رہا۔

اُس مضمون کا خلاصہ یہ تھا۔ کہ اساتذۂ وقت یعنی رشید۔ عارف۔ افتخ

جاوید فصاحت۔ انجمن وغیرہم۔ ہر شاعر سند طلب کو بغیر اُس کی قابلیت کا صحیح اندازہ کیے ہوئے ایسی سند نہ دے دیا کریں جس کا وہ مستحق نہ ہو۔ کیونکہ ایسے اسناد سے عوام میں زبان کے متعلق غلط فہمی کا اندیشہ ہے مبادا ایسے سند یافتہ شعرا کی خود ساختہ بندشیں یا محاورات جو ادب اردو کی حدود میں نہ ہوں۔ دوسرے غیر مطلع اصحاب میں رواج پا جائیں اور عام ادب پر غیر صحیح اثر پڑے۔"

گو آپ مرحوم کا یہ خیال درست تھا مگر میں یہ ضرور کہوں گا کہ مرحوم سے تھوڑی سی غلطی ہوئی اگر اُس مضمون کا نشانہ فرداً فرداً اساتذہ لکھنؤ کی طرف نہ ہوتا بلکہ عام ہوتا۔ تو غالباً کسی کو شکایت نہ ہوتی اور معیار بھی اپنی پوری رفتار سے جاری رہتا۔

اب میں اس بحث کو ترک کر کے مطلب پر آتا ہوں یعنی ماہانہ مشاعروں کے علاوہ معیار کا ایک سالانہ بہاریہ مشاعرہ ایک وسیع پیمانہ پر ہوا کرتا تھا اور مصرعہ طرح کی ردیف لفظ "بہار" ہوتی تھی۔ موسم بہار ۲۰ جولائی ۱۹۱۲ء میں بہاریہ مشاعرہ جناب شہنشاہ میرزا صاحب وکیل کے باغ میں ہوا جو گومتی پار واقع ہے۔ مصرعہ طرح یہ تھا۔

لوح معیار نظر آتی ہے تصویر بہار

معارکۂ مشاعرہ اور رشید

اچھی اچھی غزلیں پڑھی گئیں۔ مشاعرہ کامیاب رہا۔ مشاعرہ کے قبل ہی تمام شہر میں اس مصرعہ کے چرچے تھے۔ اور واقعی طرح بھی نئی تھی۔ قریب قریب لکھنؤ کے سبھی کہنہ مشق والے ہم سب نے اس طرح پر طبع آزمائی کی عام اس سے کہ شریک مشاعرہ ہوئے یا نہیں رشید مغفور سے لوگوں نے غزل بھیجنے کی درخواست کی مگر انھوں نے غزل نہیں کہی۔ مشاعرہ کے بعد کئی مہینے گزر گئے۔ یکایک رجب کا چاند نکلا۔ لکھنؤ کے مرثیہ گویوں میں غیر معمولی سرگرمی پیدا ہو گئی۔ سامعین میں آخری تاریخوں کا شدید انتظار

شروع ہوگیا۔ حتّٰی کہ متعدد ننھے مرثیے ختم ہو چکے۔ اور ہر مرثیہ کے متعلق رائے عامّہ قائم ہو چکی۔ اب چودہویں رجب کی صبح نمودار ہوئی عاشقِ آلِ اطہار رکن العزا میر لوا علی صاحب (جن کا مشہور تعزیہ ۲۰ ربیع الاول کو اُٹھتا ہے) کی مجلس کے سامان حسینۂ اکرام اللہ خاں میں نظر آنے لگے۔ جوق جوق لوگ آ کر جمع ہونے لگے۔ اور ذاکرِ خاندانِ رسالت جناب رشید کا انتظار ہونے لگا اسنے میں پالکی نمودار ہوئی رشید آئے اور تھوڑا سا آرام لینے کے بعد زیب ممبر ہوئے۔ مرثیہ شروع ہوا ساقی نامہ ختم ہوا۔ سامعین نشۂ مضامین میں سرشار۔ ساقی کوثر کو یاد کر کے ذاکر کو مستِ آوازِ دل میں داد دے رہے تھے۔ کہ یکا یک رشید نے مرثیہ کا ورق اُلٹا۔ بہار آ گئی گل و بلبل کے نازک تعلقات کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھنچ گئی۔ فضا میں بارہ کا رنگ مجلس پر چھا گیا۔ کہ ایک مرتبہ رشید نے بلند مگر نرم آواز میں جناب عزیز۔ جناب محشر کو یوں مخاطب کیا۔ بھئی عزیز سنو! بھئی محشر سنو! لوگ سمجھے کہ کوئی خاص مضمون ہے جس پر ان حضرات کی توجہ چاہتے ہیں مگر رشید نے جو بند شروع کیا تو معیار سے گذشتہ ہمارے مشاعرہ کی طرح میں۔ پھر کیا تھا۔ یہ دو نو بند رشید کی قوّتِ غزل گوئی کا ثبوت دینے لگے۔ فرماتے ہیں۔

فصل بدلی کہ یہ تغیر ہوا تیرِ بہار	ہیں دلِ اہلِ حسد زخمیِ شمشیرِ بہار
اب تو ہر شے میں نظر آتی ہے تصویرِ بہار	گل رگوں سے ہوا ہے رشتۂ زنجیرِ بہار

کبھی آہستہ کبھی تیز ہوا چلتی ہے
اسی موسم میں جنوں خیز ہوا چلتی ہے

خود بہار آئی ہے کیا چیز ہے تصویرِ بہار	قطرے شبنم کے بنے بہرِ خزاں تیرِ بہار

ہوئی ہر شئے میں شرکت ایسی تری تاثیر بہار — در کی زنجیر کا اب نام ہے زنجیر بہار

حسن پورا ہے جواں صورت جاناں ہے بہار
انتہا ہو گئی خود اپنے پہ نازاں ہے بہار

بہار یہ مشاعرہ کے قبل لوگوں کا خیال تھا اور اُس کے بعد بھی قائم رہا۔ کہ ردیف اور قافیہ کی اضافت کو سنبھالنا بہت مشکل ہے۔ لیکن رشید کی مشاقی اور خداداد طبیعت نے قافیہ و ردیف میں ایسا ربط پیدا کر دکھایا۔ کہ سبحان اللہ یہی وجہ تھی کہ تمام لکھنؤ کے شعرا ہم آواز ہو کے کہتے تھے " ہم کو سوائے رشید کے مرثیہ کے دوسرے میں مزا نہیں آتا " ذیل میں انتخاب غزلیات پیشکش ناظرین ہے۔ رشید کے پورے مجموعہ غزلیات کا طبع ہونا غیر ممکن ہے۔ ہاں اگر کسی وقت اُردو کی قسمت نے یاوری کی تو اُس کے چھپنے کی کوئی صورت پیدا ہو جائے گی۔

انتخاب غزلیات

مار ڈالے گی ہمیں یہ خوش بیانی آپ کی — موت کا پیغام آئے گا زبانی آپ کی
زندگی کہتے ہیں کس کو موت کس کا نام ہے — مہربانی آپ کی نامہربانی آپ کی
بعد مردن کھینچ لایا جذب دل سینہ پہ ہاتھ — ایک انگوٹھی ہے جو پہنے تھا نشانی آپ کی
رنگ عالم کا بدلنا آپ کے صدقہ میں ہے — جمع کر رکھی ہیں پوشاکیں پرانی آپ کی

نمو کی فصل جوانی کی آمد آمد ہے — کہ جا بجا سے مسکنے لگی قبا اُن کی

شروع اہل محبت کے امتحان ہوئے — یہ اُن کو ناز ہوا ہے کہ ہم جوان ہوئے

سرخ آنکھیں ہیں ابھی اُٹھے ہیں خواب ناز سے — ہاتھ ماتھے پہ رکھے لیٹے ہیں عجب انداز سے

لاکھوں مشتاقوں کی مٹی میں ملی ہیں آنکھیں
تیرے کوچے میں پتہ دیتے ہیں ذرات مجھے

طالب دید سے یوں بے خبری کرتے ہیں
آپ سو یا کیجیے آنکھوں میں کٹی رات مجھے

ہجر میں ابر سیہ آئے گا دکھ . دینے کو
اب کے رونے ہی میں کٹ جائے گی برسات مجھے

لے نہ جاؤں کہیں حاجت پہ دعا مانگ رشید
اتنی توفیق دے اے قاضی حاجات مجھے

آپ کو شک ہے کہاں ٹوٹے تھے تارے رات کو
دم بدم آنسو ٹپکتے تھے ہمارے رات کو

اُن کی آرائش بھی ہوتی ہے موافق وقت کے
دن کو منہ دھویا گیا گیسو سنوارے رات کو

ٹوٹے تارے سیکڑوں یوں فرقتیوں کی دل جلے
درد سے جس وقت ہم تم کو پکارے رات کو

چونک اُٹھے سب مری آواز جاتی دور تک
خوف تھا دل میں کہ اُٹھی نا بیے رات کو

ہجر کی مدت نہ ہوگی ختم ثابت ہو گیا
دن کو ذرے گن چکا میں اور تارے رات کو

آگئی صبح قیامت اور میں سویا نہیں
پھر نہ آئی نیند جب سے تم سدھارے رات کو

دل جگر لینے پھر آئے صبح کو کہتے ہوئے
رہ گئے بستر پہ دو موتی ہمارے رات کو

ڈھونڈتے پھرتے ہیں دل کو صبح سے ہر سو رشید
دلربا تھا ایک پہلو میں ہمارے رات کو

گرمی رفتار ہے تیری یہ پتا دیتے ہیں
۱ دم بدم لو مرے نقش کف پا دیتے ہیں

دل کی تم بات سمجھتے ہو زباں گو نہ ہلے
خوب سنتے ہو جو چپکے سے صدا دیتے ہیں

معاف کرتے ہیں ابھی کھینچ وہ تیغ ادا
۱ دوست آ کر مجھے پیغام قضا دیتے ہیں

جا لگو اے ملکِ عشق کے ہونے والو
شہر [illegible] ارباب [illegible] در پا رضا او دیتے ہیں

نظر میں خانۂ صیاد بھی ہی گلشن بھی
کہ ہم کو یاد قفس بھی ہی اور نشیمن بھی

چمن میں تھیں مجھے ساری اذیتیں راحت
بہت تھا مرا اُجڑا ہوا نشیمن بھی

بنا تھا کیا مرا سیلاب اشک ریگ رواں
کہ جس سے تر نہوا ایک تار دامن بھی

لگا کے کان سُنے کون التجا میری
درِ قبول کے قابل نہیں دعا میری

صدا یہ آتی ہی جنبش سے تیرے دامن کی
نسیم میری ہی گلزار میں صبا میری

یہ خوف ہی کہ میں کچھ عرض کر نہیں سکتا
مرے لبوں سے لپٹ جاتی ہی صدا میری

جفائیں سہ کے جو در سے ترے نہیں ہٹتا
گلے سے مجھ کو لگا لیتی ہی وفا میری

وہی حیات کا باعث ہی جس پہ مرتا ہوں
وہی مرض ہی مرا اور وہی دوا میری

کون کہتا ہی کہ اور ایسا حسیں دل چاہیے
گر عنایت ہو تو غم سہنے کے قابل چاہیے

حسرت و درد و الم اندوہ و غم پیدا کیجیے
دیکھیے انصاف سے کتنا بڑا دل چاہیے

وہ تو ہیں معشوق پر سینے کو اتنا فرق ہی
آپ کو دل چاہیے ہم سینے کو تحمل چاہیے

ہاتھ پہلو پر دھرا ہی کرتے ہیں دلبر کی فکر
پوچھتے پھرتے ہیں کیسا آپ کو دل چاہیے

ہر نفس جس کو زیادہ ہو تمنا قتل کی
اے مری جاں اس کو ہر دم ایک قاتل چاہیے

طعن ساقی کی یہ ہی ہاتھ میں گو ساغر ہی
استعارہ کوئی کیجیے تو بہت بہتر ہی

شوق مضمون مرادوں کے بڑھا دیتا ہی
ایک کلمہ کو اگر دیکھیے اک دفتر ہی

گو خزاں آ گئی باقی ہی ابھی شان بہار
گل کی ہنسی ہی کہ بلبل کا شکستہ پر ہی

ہونے جب گو یہ طریاں میں تکلف نہ رہا
دیکھیے پاؤں کسی کا ہی کسی کا سر ہی

نہ رہا اب تو کوئی وقت خزاں سے خالی
جو ہوا ہے چمنِ دہر میں وہ صرصر ہے

دل ہی ڈبوئے بھی ڈبوئے بھی بچائے بھی رشید
یہی کشتی - یہی دریا ہے - یہی لنگر ہے

ہر اک تربت کے گل چومیں نشانِ پائے جاناں کو
چلے دو گام جنت کر دیا کوئے غریباں کو

خدا وحشت میں برکت دے سلامت رکھے ایماں کو
کہ بسم اللہ کر کے چاک کرتا ہوں گریباں کو

تمہارے وہم سے ہے اے جان ہمارا شہر میں آنا
نہیں منظور گر تم کو نہ چھوڑیں گے بیاباں کو

مجھے جوشِ جنوں ہے لیکن اتنی ہوشیاری ہے
پہنچے ہاتھ دامن ہی بچاتا ہوں گریباں کو

گھرا ہے میکدہ پر ابر شرما کر نہ برسے گا
ذرا دم بھر نہ رونے سے منع کر دو اپنے گریاں کو

جو ممکن ہو تو کچھ سامانِ دستِ جمع ہو جائے
پریشانی ستایا کرتی ہے تیرے پریشاں کو

نظر بازی کی کیفیت ترے قیدی کو حاصل ہے
اب آنکھیں ڈھونڈتی ہیں رخنۂ دیوارِ زنداں کو

رشید ان کو پکارا قبر سے اغیار کہتے ہیں
بتائیں کس نے باتیں ساکنِ شہرِ خموشاں کو

سیئے جاتے ہیں کفن آپ کے دیوانوں کے
تار دامن کے ہیں ٹکڑے ہیں گریبانوں کے

دل ہوئے ہیں ہوسِ بوسۂ زلفوں کے اسیر
اب تو آ پہنچے ہیں نزدیک ترے شانوں کے

دل جگر پڑھتے ہیں کلمہ ترا ملکِ تن ہیں
ساری بستی میں یہ دو گھر ہیں مسلمانوں کے

وحشیوں کا ترے اتنا تو پتہ پایا ہے
استخواں ملتے ہیں گوشوں میں بیابانوں کے

کیا ترے نام میں تاثیر ہے سبحان اللہ
ایک دل ہو گئے تسبیح کے سو دانوں کے

شاعروں کے لیے توہین کا باعث ہو رشید
تم نہ جایا کرو مجمع میں سخن دانوں کے

نہیں ہے وہ میاں تم کو جان جاں ہم لوگ مرتے ہیں / ہمیں خود آتی ہے ہچکی جو تم کو یاد کرتے ہیں
عجب بے رحم ہیں طفل حسین گلزار ہستی میں / گلوں کو توڑتے ہیں بلبلوں کے پر کترتے ہیں
خبر کب شانہ و آئینہ کی تھی عہد طفلی میں / جوانی آگئی ہے جب سے وہ پہروں سنورتے ہیں
ذرا ہٹ جائیں سب منظور ہے اس وقت تنہائی / مری تربت میں وہ شانہ ہلانے کو اترتے ہیں

جام چلنے کو ہے سب اہل نظر بیٹھے ہیں / آنکھ ساقی سے چرانا ہم ادھر بیٹھے ہیں
تیرے بے تاب کبھی آہ جو کر بیٹھے ہیں / زلزلہ آگیا ہے سیکڑوں گھر بیٹھے ہیں
ظلم صیاد نے پرواز سے مایوس کیا / فکر میں سامنے رکھے ہوئے پر بیٹھے ہیں
صاف باطن ہوں نظر آرہے ہیں مجھ کو صاف / گو ہیں پردے کے ادھر ہم وہ ادھر بیٹھے ہیں

دل جلے قبروں سے نکلے بھی تو کیا حاصل ہوا / بس یہی نہ گرمی روز قیامت بڑھ گئی

ایک مدت کا ہے قصہ کسی جانب دل تھا / اب نہیں یاد یہ پہلو ہے کہ وہ پہلو اک

سلسلہ جنبان وحشت ہیں نئی تدبیر سے / طوق منت کے بدلتے ہیں مری زنجیر سے

دل کے ٹکڑے جو زمیں پا ساتھ لیتے جائیے / میری خاطر جمع ہو جائے کسی تدبیر سے
فتح میں بھی کی کمیں ہم پہ ہزاروں سختیاں / سیکڑوں طوفاں اٹھے آب دم شمشیر سے
اے نظر انصاف سے دیکھو ذرا سوئے شہید / عاشقا اس غزل کیا ہو سکے تحریر سے

امتحان حسرتِ پرواز کا منظور جو تھا
ذبح کر کے مجھے صیاد نے پر کھول دیے

جو نہ صبر اور وہ ہم پھر تو کسے بے قرار کرتے
ابھی برق کا طریقہ فلک اختیار کرتے

غم و درد و رنج سہہ کر بچے ہیں ہم دل اپنا
انہیں بے وفائیوں پر ترا اعتبار کرتے

وہ نہ آئے مر گئے ہم اگر آتے بھی تو کیا تھا
یہی جان صدقہ کرتے یہی دل نثار کرتے

جو خلافِ امید کے ہو تو شکستہ خاطری ہیں
کئی ٹکڑے دل کے ہوتے جو قلم ایک بار کرتے

خبر اس کی پہلے ہوتی کہ نہ آئے گا یہ ہم کو
تو رشید شعر کا فن نہ ہم اختیار کرتے

تفرقہ ڈال دیا آ کے ترے تیروں نے
ٹکڑے بھی اس دلِ صد چاک کے باہم نہ رہے

شمع محفل ہو گئی کیوں پاس رہیں پروانے
عشق بے کار ہے جب حسن کا عالم نہ رہے

خلق میں سیکڑوں طوفان اٹھا کرتے ہیں
ہے جو منظور نظر چشم مری تر نہ رہے

لطفِ نظارہ پہ موقوف ہوا اپنی ہستی
منہ ادھر آپ نے پھیرا کہ ادھر ہم نہ رہے

گر بھلا چاہتے ہو خط پہ یا مائل نہ ہو
وہ پھلے پھولے جو اس سبزے سے بیگانہ ہے

ہم کو بعدِ دفن بھی اب تصورِ یار ہے
رات بھر بالیں پہ شمع روشن جاتا ہے

کوہ غم میں ہم سر کے ٹکرانے سے تنگ آ گئے
کیا قیامت ہو اگر بستی میں دیوانہ رہے

سیکھتے ہیں بازو جو ہوس اڑنے کی آ رہی دل میں ہمیں
حسرتِ پرواز پوشیدہ پرِ بسمل میں ہے

ذرہ ذرہ میں نہیں سکھیں ہمارے لختِ دل
حلقہ حلقہ آہ - زنجیرِ درِ قاتل میں ہے

سختیِ دل کا تذکرہ کرتے پھرے آتشِ اشک
ساتھ یادِ کارواں سالارِ ہر منزل میں ہے

کچھ ایسے کام تھے باقی کہ ساتھ جا نہ سکے
معاف کیجیو اہلِ عدم ہم آ نہ سکے
بس ایسے حال میں عاشق کو آپ نے دیکھا
حواس جا نہ سکیں اور ہوش آ نہ سکے

ترا حسن فقط ہے منتظر اک خندۂ گل کا
نظر سے جس نے ہو یا قدر کچھ ہر گریباں پر
زلیخا جاں کی ایسے جبر ہی تھی یوسف کو
کہ جس کی آہ گھر میں ، برق گر گئی آ کے زنداں پر

اگر آپ کو خدا نے جانِ جہاں بنایا
لیکن غضب تو یہ ہے نامہرباں بنایا
کھاتا ہے ہاتھ اٹھا کر سو سے شجر پہ گلچیں
کیوں بد نصیب تو نے پھر آشیاں بنایا

جلوہ گر بام پہ جب مہرِ رخِ یار نہ تھا
کوئی کوچہ میں بجز سایۂ دیوار نہ تھا
تیری چتون میں وہ مانے کی ادا آفت تھی
کس کا دل تھا کہ قریبِ لبِ سوفار نہ تھا

سامنے لاؤں جگر دل کو نشانہ کیسے
میں اشارہ ترا سے ناوکِ مژگاں سمجھا

ذکر کرتا ہے چھری قصہ اور صیاد کا
اے اسیرانِ قفس وقت آ گیا فریاد کا

ہم صفیروں کی طرح سے چھوٹ کر کیا جاؤں گا
میں ہوں پروانہ چراغِ خانۂ صیاد کا

مری آنکھوں کو ہی خوں بار رہنا
ذرا اے ابر تر ہشیار رہنا
پس مردن نہ رکھے گی صبا خاک
ترے کوچہ میں ہے بیکار رہنا

محفل میں جو روز آتے ہیں اُن لوگوں سے پوچھو
کب متصل در مرا بستر نہیں ملتا

زبانِ تیغ سے کب گفتگو میں رہ پاتا
ہیں کوئی خون کا قطرہ نہ ٹھکے بہ جاتا

زاہد سا شخص بن گیا ہے میکدہ میں دُزد
چپکے سے ہاتھ جانب پیمانہ لے گیا

غش میں بھی تھا یار ہی کا انتظار
چونک اُٹھا میں جب ذرا کھٹکا ہوا
اے رشید اشکوں کا پھیلا عمل
دامنِ محشر بھی ہے بھیگا ہوا

بعد مرنے کے نہ اُتریں پاؤں سے گھنگرو
زنجیر ہم سے اور جنوں سے سلسلہ رہ جائے گا

سیہ ترے حکم نہیں یاں سے ہیں جانے والا
فقیر ہے کون سمجھے یاں سے اُٹھانے والا

سینہ پہ جب کبھی کوئی آنسو ٹپک گیا
اس درجہ ناتواں ہوں کلیجہ دھڑک گیا

جنوں کو وجہ بقا ہے شکستہ حالوں کا
کر آب خضر بھی پانی ہمارے چھالوں کا

ہیں پریشاں جمع کر کے آپ کے ارمان ہم | اپنے دل کو جانتے ہیں حشر کا میدان ہم

ٹکڑے شکستہ حال دل ناتواں کے ہیں | اتنا نہ پوچھیے یہ مسافر کہاں کے ہیں
کیا جوڑتے ہیں آپ دلِ پارہ پارہ کو | معلوم بھی ہے کون سے ٹکڑے کہاں کے ہیں
دم لینے جا بچا تری شمشیر میں کہیں | شکوے زبان تیغ پہ مجھ ناتواں کے ہیں

اب شب غم صبح ہو جائے گی یا آئے گی موت | فیصلہ دم بھر میں ہے یا تو رہیں یا ہم نہیں

غم دورِ چمن کا یہ تفرقہ ہے | چمن میں گل ہے بلبل آشیاں میں

مجھ کو منظور ہے مرنے پہ سبکباری ہو | اور احباب کو ہے فکر کفن بھاری ہو
آتشِ حسن جوانانِ چمن بھڑکا دے | جو گل سرخ کی پتی ہو وہ چنگاری ہو

کیا سبب ہے کیوں تڑپتی ہیں قفس میں بلبلیں | دیکھ اسے صیاد گلشن کی ہوا آئی نہ ہو
میری چشمِ شوق کو کیا ہو گیا ہے اے رشید | اس سے لڑنا کیا کبھی جو آنکھ شرمائی نہ ہو

جی بھر کے دیکھ سکتے نہیں گل کو عندلیب | کھٹکا لگا ہوا ہے کہیں باغباں نہ ہو
آج یوں خاک نشینِ درِ قاتل اٹھے | سیکڑوں لاشیں اٹھیں سیکڑوں ہی دل اٹھے
ساقیا شیشہ جو توڑا جیسے دردی | مست محفل سے تری [illegible]

کیسا کوچہ ترا دنیا سے اٹھا جاتا ہوں
آج کچھ ایسی طبیعت مری گھبرائی ہے

میرے درد عشق سے ایذا ہی سہی جی کو
عشق گلیوں میں پھرے لیکن پردہ ہی
موت بہتر ہے جو اتنا ملول ہماری کہے
حسن پردہ میں چھپے اور کہیں بازاری کہے

مجنوں نے راہ عشق میں کھینچے مرے قدم
الفت میں اتنی بات تو پیدا [illegible]

جو ہوا ہو صورت باد صبا [illegible] تیز ہے
دل کے ٹکڑے کر دیے [illegible]
ہے [illegible] کیا [illegible]
دل کا [illegible] ہے کہ اک [illegible] آفت خیز ہے
کس قدر تیغ ابروئے یار [illegible] تیز ہے
[illegible] خیز ہے

پھر چکے پامال کر دیے ویراں کر چکے
[illegible] آپ احساں کر چکے

تھا کہ حسرت نے کئے دل [illegible]
آپ کے دیوانے ساتھ اپنے بیاباں لے گئے

قفس میں دام میں [illegible] کا یہ باعث
ہوا [illegible] کی ہر آکے [illegible] گل تھا

جوش وحشت میرے تو دل [illegible] ابھی سہی
دل میں [illegible] حسرت [illegible]
[illegible] ابھی سہی
[illegible] تمنا بھی سہی

تیرہ بختی سے ہی شکوہ مفلسی سے ہی گلہ
اپنی وحشت سے ہی شکوہ دوسرے سے کیا گلہ

روشنی ممکن نہیں شام غریباں کیا کہیں
[illegible]

تیری یہ ادنیٰ تیغ کی [illegible] کا ناز
اڑ کر پڑی ہی خاک شہیدان ناز کی

پہلے گلے تو کاٹ کے دو چار دیکھیے
دامن کی سمت بھی ذرا رفتار دیکھیے

یاس و حسرت سے [illegible]

[illegible]

نہ زخم تن کھلا کوئی نہ ٹپکے خون کے قطرے
رشک شہید احباب [illegible]

[illegible] والا ہی
[illegible] والا ہی

کب تیرے دام محبت سے رہا ہونا ہے

[illegible]

[illegible] دکھاؤں تم کو

[illegible]

آرزوئے شہادت کی وصیت سب سے ہے

[illegible]

تھا شام سے کچھ حال کا [illegible]
اے جوش جنوں [illegible]

[illegible]

نظر یوں اُن کی میری سمت کو پھر پھر کے آتی ہے	کہ جیسے ہر طرف گرتا ہوا سرشار جاتا ہے
آج پھر کل کی طرح ہجر کی رات آتی ہے	دیکھیے کیا ہو وہی دل ہے وہی پہلو ہے
اس بےخودیِ عشق کا عالم ہی جدا ہے	جب غور سے دیکھو نہ فلک ہے نہ زمیں ہے
احباب کو ہے فکر سحر ہو تو وہ آئیں	یاں صبح کے ہونے ہی کی اُمید نہیں ہے
واہم گیسو سے جو چھوڑا تو گذر جائیں گے	عاشقِ زلف اسی رات کو مر جائیں گے
وہ نہلاتے ہیں تو کہتے ہیں بگڑ کر گیسو	چھوڑ دیجیے چھوڑ دیجیے ہم آپ سنور جائیں گے
ہم گئے دُنیا سے لاکھوں دل کے ارماں رہ گئے	تھے جو تم کو یاد وہ بھی عہد و پیماں رہ گئے
کون اپنے خون کا قاتل سے دعویٰ کر سکا	ہاتھ اُٹھ کر سیکڑوں سوئے گریباں رہ گئے
ناتوانی یہ بتا دے کس سے چاہوں گا مدد	گر اُلجھ کر ہاتھ میں تارِ گریباں رہ گئے
قتل گہ میں پاؤں سے تا دیر ٹھکرایا کیا	ایک سر پر سیکڑوں قاتل کے احساں رہ گئے
کیا شب آ سمجھتا ہوں جو محفل میں چھلکتا ہے جام	میں تو واقف ہوں کہ بیتابی کی لذت دل میں ہے

رشید اور مرثیہ — رشید نے میدانِ مرثیہ گوئی میں جلد سے جلد اس وجہ سے قدم رکھا۔ کہ اول تو یہ ننہال کی میراث تھی ثانیاً یہ کہ کوئی دوسرا ذریعہ ایسا نہ تھا۔ جو آئندہ اُن کی اور اُن کے متعلقین کی معاش کا سبب ہوتا۔ سوچے کہ عشق و تعشق کے دورانِ حیات میں حصولِ کمال کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ چنانچہ مختصر مختصر متعدد دیئے مرثیے تصنیف کیے۔ اور عشق مغفور کو دکھائے جو موضوعاتِ شاعری کے اُس وقت بہتر سے بہتر جاننے والے تھے۔ دوسرے تعشق مرحوم کے خداداد رنگِ کلام نے رشید پر کچھ ایسا اثر کیا کہ بغیر اصلاح لیے اُن کے کلام میں تعشق کی نازک خیالیوں کی بو آنے لگی۔ ماسوا اس کے خود بھی طبّاع تھے۔ اس وجہ سے جدّتِ طبع کے میدان میں دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگے۔ مگر یہ زمانہ گویا صرف مشق ہی مشق کا تھا گو کبھی کبھی عشق یا تعشق کی پیش خوانی بھی کر دیتے تھے۔ اور لکھنؤ والوں کے سامنے اپنی آئندہ بہار کے نمونے پیش کر دیتے تھے +

[illegible] — اب وہ وقت آیا کہ عشق کا انتقال ہوا۔ تعشق نے وفات پائی۔ جدھر دیکھتے ہیں کوئی کفیل نظر نہیں آتا۔ چاروناچار طبیعت پر زور ڈالا۔ اور چُست مرثیے کہنے پڑھنے کی کوشش کی۔ مگر اُدھر شہیرِ انیس اپنی پوری آواز سے گونج رہا تھا۔ یعنی انیس کے کلام کا سکہ دلوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ کوئی معمولی بات نہ تھی کہ عوام میدانِ سخن میں جس قدر کی نظر سے انیس کو دیکھ رہے تھے اُس کا عشرِ عشیر بھی کسی دوسرے کا حصّہ ہوسکتا ساتھ ساتھ مشکل یہ تھی کہ جو رایِں میدانِ مرثیہ گوئی میں انیس کا قلم پیدا کر گیا تھا۔ اُس کی پابندی بھی ناگزیر تھی۔ کیونکہ انیس کی آواز کا اثر ابھی محو نہ ہوا تھا۔ اس لیے کوئی دوسرا رنگ مطبوعِ عوام نہیں ہوسکتا تھا۔ اگر کوئی متنفس انیس کے رنگ سے علاوہ کسی دوسرے رنگ کو

اختیار کرنا بھی تو بے سود۔ وہی مرثیہ وہی چہرہ۔ وہی سحر وہی خاندانِ رسالت۔ وہی واقعات کربلا۔ وہی لڑائی وہی نتیجہ اور ان سب کا ایک بہتر کہنے والا انیس موجود پھر رشید کو دفعتاً اتنی قبولیت کہاں سے ہو جاتی +

لیکن رشید بھی سمجھتے تھے کہ اگر نیا مرثیہ لکھنؤ میں پڑھا جائے تو ایسا تو ہو کہ لوگ اچھا نہ کہیں تو برا بھی نہ کہیں۔ لہذا جو مرثیہ کہا اس میں اپنی انتہائی قوت صرف کی۔ اور ایسے مرثیے نکالے کہ زبان زدِ عوام ہونے لگے۔ رفتہ رفتہ یہ نوبت پہنچی کہ جہاں مرثیہ گوئی کا ذکر ہوتا تو انیس کے ساتھ ساتھ رشید کا نام بھی ضرور لیا جاتا +

رشید مرثیہ گو کی شہرت کا پہلا سبب

اس قدر جلد رشید کی مرثیہ گوئی میں شہرت کا باعث شعراء کی رائے میں دوسرے اسباب کے ساتھ ان کا ایک مشہور غزل گو ہونا بھی تھا جب تک نفیس زندہ رہے رشید بیشتر شاعروں میں شریک ہوتے رہے۔ اگر انیس کا نام مرثیہ گویوں کی فہرست میں اول تھا تو رشید کا نام بھی غزل گوئی میں فرد لیکن چونکہ رشید نے اپنی قوت غزل گوئی سے مضامین مرثیہ گوئی میں کام لینا شروع کر دیا تھا۔ لہذا ان کی برق مثال طبیعت نے بھی اپنا کام کیا اور جدت خیال اور چستی زبان کے ایسے ایسے انمول نمونے پیش کیے جنہوں نے رشید کو رشید بنا دیا اور سامعین کے دلوں میں گھر کرا دیا +

اب رشید میدان مرثیہ گوئی کی پہلی منزل طے کر کے شہرت کے اس نمایاں مقام پر پہنچے جہاں سے یہ صدائیں آنے لگیں کہ رشید تو گویا دوسرا انیس پیدا ہو گیا عوام کی اس قدر افزائی نے رشید کا دل بڑھا دیا اور اساتذہ سخن نے ان کو زبان انیس کا مستحق وارث منوا دیا چنانچہ اس رباعی میں جو [illegible]

رباعی

ہی عشق کا رنگ ہر سخن میں میرے	لاکھوں گلِ مضموں ہیں چمن میں میرے
مشتاق کلام ایس کا مجھ سے سنیں	گویا ہی زبان اُن کی دہن میں میرے

عروج

جس وقت تک کسی اہلِ کمال کی ترقی کے اسباب فراہم نہیں ہوتے اُس وقت تک اُس کا جوہر نہیں کھلتا۔ مگر جس وقت ایک حد تک زمانہ روشناس ہو جاتا ہی تو پھر اُس کو زیادہ مدد کی ضرورت باقی نہیں رہتی بلکہ دوسرے اُس سے مستفیض ہونے لگتے ہیں اور دانا لوگ سمجھتے ہیں کہ ہر چیز کو ابتدا میں مدد کی ضرورت ہوتی ہی اور ایک وقت ایسا بھی آتا ہی کہ پھر احتیاج نہیں رہتی مثلاً ایک پودا اُس کی کونپلیں نکلتی ہیں اور اغصان کی وجہ تربیت کا محتاج ہوتا ہی جب اُس کو پوری نشو و نما ہو جاتی ہی تو وہی نخلِ ثمر درخت پاتا ہی اور جھولیاں کی جھولیاں پھل دیتا ہی یہی حال عوام کا ہی کہ ایک مدت تک ذریتِ کمال کو پرورش کرتے ہیں پھر اُس کے سایہ میں بیٹھ کر فرحتِ روحانی حاصل کرتے ہیں یہی یہاں وہ گمنامی کے باریک پردہ سے نکلا۔ اُس کے فیوضات عوام میں پھیلنے لگے۔ اور اُس کا نسخۂ والا ام دُنیا کی لوحِ دل پر محفوظ ہونے لگا +

دو صاحبِ کمال

آج ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا سے نظم و نثر میں جو اہلِ کمال کوس لمن الملکی بجا چکے ہیں۔ اُن کے بعد کی آنے والی نسلوں سے اُن کے کمال سے کیسے کیسے دریا بہے ہیں میدانِ سخن میں دیکھیں تو کہا جاتا ہی کہ فلاں شخص میر کا رنگ کہتا ہی فلاں غالب کی ترکیبوں کا دلدادہ ہی فلاں آتش کا اتباع کرتا ہی فلاں طرزِ مرثیہ میں انیس کا پیرو ہی فلاں دبیر کا +

نثر میں دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں۔ فلاں شخص آزاد کی سی عبارت لکھتا ہی۔ فلاں شبلی کا

چربہ اُتارتا ہی۔ فلاں کی عبارت میں رنگینیِ شعر رہی +

اگر ان لوگوں کو زمانہ نے اظہارِ کمالات کا موقعہ نہ دیا ہوتا۔ تو آج کتابِ ادب میں سادے ورق نظر آتے اور وہ بھی بے رونق +

لکھنؤ میں جہاں انیسؔ اور دبیرؔ تھے وہاں ایک تیسرا اگرچہ مختصر گروہ عشقؔ کے ماننے والوں کا بھی ضرور تھا۔ اور یہ حضرات بھی دوسروں کی طرح اپنے پسندِ خاطر ذاکر کے خاندان سے محبت رکھتے تھے +

چنانچہ ایک شخص مرزا عبد العلی نامی اشرف آباد میں رہتے تھے۔ اور عشقؔ مغفور کے فدائیوں میں تھے۔ اُن کی مجالس میں سوائے خاندان عشقؔ کے دوسرا ذاکر زیبِ ممبر نہ ہوتا تھا۔ عشقؔ مرحوم نے بڑے بڑے معرکہ آرا مرثیے اُن کی مجالس میں پڑھے۔ اُن کے بعد تعشقؔ مرحوم کے لیے وہی ممبر زینۂ شہرت بنا۔ اور اب آخر میں رشیدؔ کی باری آئی۔ اور اُن کا فرض ہوا۔ کہ اُس آبائی ممبر کے وقار کو اپنے بزرگوں کی طرح برقرار رکھیں۔ چنانچہ بعد وفات تعشقؔ مرحوم رشیدؔ نے ابتدائی نہیں بلکہ آزمائشی مجلسیں اشرف آباد میں پڑھیں +

ان مجالس کے مجموعوں کا اندازہ۔ اس سے ہوسکتا ہی کہ انیسؔ، دبیرؔ، مونسؔ عشقؔ، تعشقؔ، وحیدؔ۔ دنیا سے اُٹھ چکے تھے۔ نفیسؔ کا آخری زمانہ تھا۔ لوگ ہمہ تن گوش تھے کہ کوئی نئی آواز ممبر سے بلند ہو۔ اور گذشتہ اہلِ کمال کے انتقال کے بعد اُن کے اشتیاقِ سماعت کو مطمئن کرے۔ کہ یکایک رشیدؔ کی اُبھرتی ہوئی طبیعت نے اُن کی شاعرانہ دلچسپیوں کے برقرار رکھنے کا وعدہ کیا اور آخر عمر تک اُس کی پابندی کی ؎

بہار و ساقی نامہ

رشید کی زبان تو جیسی تھی ویسی تھی۔ انھوں نے طرزِ مرثیہ میں طبّاعی سے کام لیا۔ اور واقعی اس کی ضرورت بھی تھی۔ وہ جدّت یہ تھی کہ انھوں نے مرثیہ کے مقررہ مضامین میں سے ایک گوشہ نکالا اور وہاں غزل کے چلبلے مضامین اس خوبصورتی سے صرف کیے کہ مرثیہ کا ایک نیا جزو ہوگئے۔ وہ کیا وہ ساقی نامہ اور بہار۔ رشید کے ہر مرثیہ میں ساغر و گل کے اڑ کا، وہ بہار دکھانے لگے۔ کہ شیدائے مضامینِ غزل مست ہو ہو کر داد دینے پر مجبور ہوئے۔ اب کیا تھا اب رشید کو بہارِ کلام کا راستہ مل گیا۔ سامعین کو مست حال کر دینے کی راہیں معلوم ہوگئیں۔ بہار کہی اور یوں کہی۔

بہار

گل و بلبل میں جو باتیں ہیں ذرا گرما گرم
اس قدر وصل بہاری سے کیا ہی آزرم
آنکھ نرگس کی جھکی جاتی ہے اللہ ری شرم
اب تو گل کی طرح ہو گئے ہیں کانٹے نرم

کھل [illegible] بلبلِ نالاں کو شکیبائی کا
پھول [illegible] داغ جگر لالۂ صحرائی کا

[illegible]

جو [illegible] پاؤں سے [illegible] کی آہٹ
ہر طرف [illegible] باغ [illegible]
اٹھنے کو سبزۂ خوابیدہ [illegible] کروٹ
اٹھ گئے سارے عروسانِ چمن کے گھونگھٹ

[illegible] فصلِ گذشتہ کا [illegible] رہا
اب ذرا بھی گل و بلبل میں تکلف نہ رہا



ساقی نامہ کہے اور یوں کہے۔

ساقی نامہ

ہم ازل سے مئے الفت کا پیا کرتے ہیں جام
عہد طفلی میں بھی رہتا تھا اسی کام سے کام
اسی صورت سے ہوئی ختم جوانی کی شام
صبح پیری ہے صبوحی کا ہے ساقی ہنگام

ہر گھڑی بھر [illegible] تیری محبت کا بھرے ہیں دم ساقی
شیر [illegible] کے [illegible] ہیں جام ساقی

مئے الفت تیری دل پہ اثر کر کے ہے پڑی
[illegible] ہے جس کی [illegible] کوثر [illegible]
اس کی رحمت سے تو اسلام کی کھیتی ہے ہری
[illegible] ہوتی نہیں مستوں کو تری بے خبری

[illegible] بادہ [illegible] کرتے ہیں
ہم تو سوتے میں ترا نام لیا کرتے ہیں

[illegible] رحمت سے [illegible]
[illegible] پھول [illegible]
[illegible] تیری [illegible] الفت سے کوئی [illegible]
[illegible] شراب [illegible]

[illegible] کیا [illegible] ساقی
[illegible] ہاتھ کی [illegible] ساقی

ساقیا [illegible] گنہگار رہا [illegible]
مئے الفت تری [illegible] کی [illegible]
سچ کہوں خلد میں جانے کی [illegible]
آنسے تجھے غصہ میں بالیں پہ [illegible] عزرائیل

[illegible] ساقی کا یہ پیمان [illegible]
[illegible] ہی [illegible] پیمان [illegible]

اگرچہ رشید کے قبل کے مرثیہ گویوں نے اس شعبہ کو بالکل نظر انداز نہیں کیا تھا

تو زیادہ اہمیت بھی نہیں دی تھی۔ انیس و نفیس کے یہاں بہار اور ساقی نامے پائے جاتے ہیں۔ مگر مختصر اور شاذ زمانہ کی رفتار کے ساتھ رشید کی پختہ کاری بھی ترقی کرتی گئی۔ کم از کم ہندوستان کے تمام شیعی حلقوں میں مشہور ہو گئے۔ اور جابجا سے طلب ہوتے رہے +

سچ تو یوں ہے کہ رشید مرثیہ میں بہار اور ساقی نامہ کے موجد تھے اور ان مضامین کو مرثیہ کے ہر حصہ میں کھپا دینے کی اس قدر حیرت انگیز قوت پائی تھی کہ جہاں چاہتے تھے بےتکلف ساقی کو پکار لیتے تھے جس موقع پر چاہتے تھے چمن آرائی کرنے لگتے تھے۔ اور کچھ ایسے اسلوب سے کہ سننے والے یکایک متحیر ہو کے بلند آواز سے داد دینے لگتے تھے +

قابل غور یہ امر ہے کہ ذیل کے بندوں کے پہلے جناب عباس کے نہر پر تشریف لانے کا ذکر کرتے چلے آتے ہیں اور سامع کو یہ گمان بھی نہیں گذرتا کہ عنقریب ساقی نامہ شروع ہونے والا ہے کہ یکایک رشید یہ مصرعہ پڑھتے ہیں ع نہر پر جائیں گے ہم تھوڑا سا پانی لینگے + اور ساقی نامہ کی یوں ابتدا ہو جاتی ہے کہ

ساقیا پھر یہ سناٹے موسم جاتا ہے	کچھ برا رنگ زمانہ کا نظر آتا ہے
ہو کسی فکر سوا نشہ جو کم پاتا ہے	جلد دے جام پیاکش ترا جلاتا ہے

نشہ ہو صاف تو اللہ کی دہائی لکھوں
خوب اڑ جائے طبیعت تو لڑائی لکھوں

ناتواں پیر ہوں تن گھل گیا غم سے کل کے	ساقیا دیدۂ دل ہو گئے جام ہلال کے
پینا منظور ہے تشنہ نہ رہے دم شکل کے	ہے یہ سامان تو ہوری عمر کا ساغر چھلکے

ہے اسے ضعف اسی نشہ کے سہارے پہنچوں
آنکھ ہو بند تو کوثر کے کنارے پہنچوں

یا (مدح عباس کے لشکر کا علم دار ہوں میں) اس مرثیہ میں اوبر کے بندوں میں سفر شہید کربلا سے تمام عالم کے متاثر ہونے کا ذکر کرنے کرتے ذکر گل و بلبل اس مصرع سے چھیڑ دیتے ہیں (کچھ تو ہو روح کو فرحت کہ عجب عالم ہے) اور مضامین بہار سے سامعین کے دلوں میں ایک تازہ لہر پیدا ہو جاتی ہے۔

اور ہی رنگ ہوا آگئی گلشن میں بہار
یوں ہوا دوڑی کہ تھرائے چمن کے اشجار
زلفِ سنبل کی ہوئی مشک فشاں عنبر بار
کر دیا سبزۂ خوابیدہ کو جلدی بیدار

دل پہ قابو نہیں بیتاب نظر آتی ہیں
بلبلیں شاخوں پہ جا جا کے اُتر آتی ہیں

جس طرف دیکھو زمانہ کی بہار آئے نظر
درمیاں میں ہے جو سورج نکلی اُس کی ہے خبر
یاسمن وہاں ہے تو عالم ہے یہاں سوسن پر
دوپہر بیچ میں ہے صبح ادھر شام اُدھر

صنعتِ صانع قدرت کو کوئی کیا بدلے
یہ نہ بدلیں گے اگر لاکھ زمانہ بدلے

رشید کو رشید کی حیثیت سے دیکھیے۔ اور داد دیجیے وہ ساقی نامہ اور بہار کے موجد تھے، اور کسی شے کا موجد اُس کو اپنی زندگی میں اتنا درجۂ کمال پر نہیں پہنچا سکتا۔ کہ اُس کی تکمیل آئندہ کا ملکُن دماغوں کے احسان سے بے نیاز رہے یعنی آنے والے اہلِ نظر اُس کے کمزور پہلوؤں کو درست نہ کریں +

تاریخ ادب میں ہمارے سامنے ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ ...ا... اول

[illegible]

[illegible] انیس [illegible]

[illegible] موجودہ [illegible]

[illegible] آنکھوں سے موجودہ [illegible]

[illegible] ساتھ [illegible] گویا [illegible]

[illegible] ان دونوں [illegible] مکمل [illegible]

[illegible] مگر [illegible] اور [illegible]

عوام بھی لیکن بعد وفات انیس رشید اور ہی رشید ہو گئے تھے [illegible]

حادثے نے بظاہر خاندان انیس میں صرف کوئی کال تا کر دیا تھا کیونکہ انیس کے بعد

ان کے نواسے میر علی محمد صاحب عارف مغفور مرثیہ کہتے تھے مگر اس وقت [illegible]

تھی۔ لہذا نظر میں نہیں پڑتے تھیں لیکن اب کو جناب [illegible] مشہور [illegible] اور

انیس و نفیس کا کمال اُن [illegible] اسے رشتہ پیدا اُن کو نفیس سے اتنا تعلق ضرور تھا کہ [illegible] لکھے۔ [illegible] اُن کے کمال سے ان کے خاندان کو وجہ تفاخر ہوسکتا تھا۔ [illegible] اُن کے کمال سے اُن کے خاندان کو اُن کا رنگ و عرض الگ ان کا جدا۔ مگر زبان انیس ضرور مشترک ہے [illegible] بار بار رشید مرحوم نے نفیس معذور سے کہا [illegible] زبان اردو میری مادری زبان ہے" اور اُن معذور نے جواب دیا [illegible] ہاں بیان سچ کہتے ہو"

رشید عارف

نفیس کے بعد عارف مغفور نے زمانہ کو اپنا معروف بنایا۔ اور خوب خوب فرمایا اس مقام پر اتنا کہہ دینا ضروری ہے کہ یہاں تک لفظ مرثیہ گوئی اپنے اصلی معنوں میں مستعمل ہوسکتی ہے کہا جاسکتا ہے کہ عارف مغفور کی بھی بہت شہرت رہی۔ عارف مغفور مرثیہ رونے رُلانے کے پہلو کہتے تھے۔ اس سے کسی کی تفریح خاطر مقصود نہ تھی۔ شان مرثیہ قائم رکھتے ہیں وہ اپنے پرنانا انیس کے پورے پورے پیرو تھے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ رشید نے مرثیہ گوئی کا حق ادا نہیں کیا۔ بلکہ یہ کہتا ہوں کہ عارف مغفور نے زبان انیس کو مدنظر رکھتے ہوئے رشید سے زیادہ نظر ڈالی میں ایک حد تک ماننے کو تیار ہوں کہ رشید کے مرثیے سلاست۔ محاورہ۔ نزاکت خیال جدت تخیل کے بہترین نمونے ہیں اور خوبیاں عارف کے یہاں کم سہی۔ مگر مرثیہ جس کا نام ہے وہ عارف کے کلام میں بہت پایا جاتا ہے۔ رشید نے بھی اکثر مرثیوں میں ایسی شان مرثیہ قائم رکھی ہے کہ جس کا جواب نہیں۔ چنانچہ منجملہ اور مرثیوں کے اُن کا یہ مرثیہ جس کا مطلع ہے

"شاہ پر بار ہیں اب الم چھائے تھے"

اُن کی بہترین تصانیف میں ایک ہے۔ اور جس کا حصہ مدّا شباب ہی پایا ہو کہ اُن کے دوسرے مرثیوں میں اُس کی نظیر کم ملے گی۔ بہر حال اُن شعراء نے بھی مصائب پر خوب خوب نظر ڈالی۔ مگر چونکہ جب شوخ طبیعت پائی تھی اور وہ سے عادی پسند آتی تھی۔ جو بات کہتے تھے اُس میں ایک خاص بات پیدا کر دیتے ہیں۔ برخلاف اس کے مصائب کے لیے سچے واقعات اور پیرایۂ الفاظ سے سوا جدت تخیل یا رنگ خیالی کی چنداں ضرورت نہیں۔

حاصل کلام یہ کہ رشید و عارف اور دو لڑکے میں انیس کا نام روشن کر گئے اور اپنے اپنے رنگ میں یادگاری کی۔ مگر خدا نے انیس ہی کو عنایت فرمایا تھا کہ اُن کے یہاں شوخی اور شان مرثیہ دونوں برابر پائے جاتے ہیں۔ اور یہ خوبی اُس شاعر ہی کے حصہ میں آسکتی ہے۔

نفیس | انیس کے بعد نفیس مرحوم نے باپ کا نام ایسا ہی روشن کیا جیسا ایک صاحب کمال کا قابل فرزند کر سکتا ہے لیکن چونکہ نفیس مرحوم کی استعداد علمی کا دائرہ بہت وسیع ہو چکا تھا۔ فلسفہ منطق ادب عربی و فارسی میں اچھی دستگاہ بہم پہنچ چکی تھی۔ مفتی میر عباس صاحب شوستری کے تبحر علمی سے کافی سیراب ہو چکے تھے اس وجہ سے کلام نہایت چست اور مربوط ہے اُلجھ و پیچ سے مملو۔ لطائف شعری ہر پہلو سے مکمل۔ اس پر طرّہ یہ کہ باوجود اس تبحر استعداد کے کلام میں ثقالت کا بالکل پتہ نہیں۔ خلاصہ یہ کہ ایک باخبر شاعر تھے۔ اُن کی زبان بھی انیس کی زبان سے جدا نہ تھی۔ فرق اتنا تھا کہ نفیس انیس کی اُردو اپنی زبان سے ادا کرتے تھے۔"

اس تمام تمہید سے میری غرض یہ تھی کہ انیس کے بعد اُن کے نام کو برقرار رکھنے والے مونس و حید نفیس رشید عارف وغیرہ رہے جب تک اردو کا آخری لفظ

[illegible]

معیت عوام بھی حاصل ہے۔ اُن کی طرز مرثیہ خوانی سب سے جدا ہے اور خوب ہے۔

رشید کا ... | مرثیہ پڑھنے کے لیے وجاہت ظاہر اور آواز مناسب زیادہ درکار ہیں۔ رشید تو ایسے قوی الجثہ تھے۔ اور نہ فطرت سے آواز بلند عطا ہوئی تھی۔ پھر مرثیہ خاطر خواہ کیونکر پڑھ سکتے۔ دوسرے یہ کہ وہ پرانے وقتوں کے لوگوں میں سے تھے۔ منبر پر بیٹھ کر جسم کو بغیر معمولی حرکت دینا بھی قبیح سمجھتے تھے اکثر فرماتے تھے کہ انیس کا پڑھنا بہت مہذب تھا وہ صرف آواز کے اتار چڑھاؤ اور اشارات سے کام لیتے تھے۔ آج کل کے پڑھنے والے تو منبر کی چولیں ہلا دیتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ رشید بہت نرم لہجہ میں سیدھا سادا پڑھتے تھے۔ اور خود ہی کہتے تھے "میں اس سے بہتر مرثیہ نہیں پڑھ سکتا"۔

واقعی مرحوم منبر اپنے کلام کی جی داد لیا کرتے تھے جس میں طرز ادا کا بالکل لگاؤ نہ ہوتا تھا اہل مجلس کے اشتیاق کی یہ صورت ہوتی تھی۔ کہ ہمہ تن محو سماعت۔

قدر شناسی | ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ شدید گرمیوں کا زمانہ ہے۔ آفتاب نصف النہار پر ہے۔ اور رشید ۲۴ رجب کو امام باڑہ اکرام اللہ خاں میں نیا مرثیہ پڑھ رہے ہیں۔ گرمی کی یہ حالت کہ تمام اہل مجلس پسینہ میں عرق عرق۔ دستی پنکھے چل رہے ہیں۔ مگر پھر بھی بمصداق "باد زن وحشت بر حشت ہے۔ دردم او باد بست ہے" تسکین نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں انسان کیونکر اطمینان سے سن سکتا ہے۔

رشید نے بھی رنگ مجلس پہچان لیا۔ اور اشعار کرتے کرتے ایک دفعہ مرثیہ روک کے فرمایا "پنکھے رکھ دیجیے اور یہ تین چار بند سن لیجیے"۔ سبھوں نے فوراً پنکھے رکھ دیے۔ جس سے رشید کے کمال اور سامعین کی قدر افزائی اور کمال شناسی کا اندازہ ہوتا ہے۔

لکھنؤ اور اہل کمال دور آصفی

آصف الدولہ کے وقت سے لکھنؤ میں ترقی علوم و فنون کی تاریخ شروع ہوتی ہے اور واجد علی شاہ مرحوم کے قیام تک ختم ہو جاتی ہے۔ اگرچہ اس کے بعد سے موجودہ وقت تک بھی اہل کمال افراد کچھ نہ کچھ [illegible] نظر آتا ہے۔ مگر وہ وقت ہی اور تھا۔ اور یہ وقت اور یہی لکھنؤ ہے جس وقت کمال کی جو قدر تھی اس کو زمانہ جانتا ہے۔ آصف الدولہ کی نگاہ قدر شناس نے گوارا نہ کیا کہ اہل کمال ہوا کی خدمتوں کا صلہ نہ ملے۔ اور اشرفیوں کے توڑوں پر مہریں لگی رہیں۔ سخاوت کا عام مینہ برسایا۔ اور برس برسایا کہ امیروں کی پوچھار آ وے کے گر و اگر و تک پہنچی۔ اور لوگ پھولے پھلے نظر آنے لگے۔

ایک عجیب حکایت

ایسے وہ مر[illegible] متعدد واقعات سے قطع نظر [illegible] واقعہ بھی کہن سال لوگوں کی زبانوں پر ورد ہے تواتر کہتا ہے کہ ایک مرتبہ ہمارا والی نواب ہاتھی پر رونق افروز۔ اپنی رعایا کی محلہ۔ حالتوں کو ان کی صورتوں سے مشاہدہ کرتا ہوا چوہری بازار سے گزر رہا تھا۔ شان یہ تھی کہ آگے آگے نہ تو گرد گستوں کی گرمی ہوتی آواز۔ نہ صدائے دور باش۔ نہ ماہی مراتب نہ چوبدار پیش پیش جو وقار شاہی کو نمایاں کرتا۔ اور جان نثار رعایا کو آداب شاہی بجا لانے کی طرف متوجہ کرتا۔ نہیں! نہیں!

شان و شوکت شاہی کی علامت تھی اور ضرور تھی۔ وہ یہ کہ چند سفید پوش چوبدار دست بستہ ہمراہ رکاب مگر خاموش۔ کہ اتنے میں ہودج سے ایک نرم آواز آئی۔ ہاتھی روکو۔ فیلبان نے فوراً تعمیل ارشاد کی۔ پاؤں کی حرکت روک دی۔ آنکس ترچھا کر دیا ہاتھی تھما۔ ارشاد ہوا۔ دیکھو وہ بڑھیا جو سڑک کے کنارے کھڑی ہے کیا کہتی ہے۔ چوبدار دوڑا۔ دیکھا کہ ایک بڑھیا ایک لوٹے کا ظرف لیے کھڑی ہے۔ [illegible]

نواب کے ہاتھی کی طرف ہو، چوبدار نے پوچھا کہ کیا کرتی ہے۔ اور کیا چاہتی ہے؟ اُس نے
کہا میں نے یہ سنا تھا اگر بادشاہ کی نظر لوہے پر پڑ جائے تو سونا ہو جائے۔ میں غریب
مفلس ہوں۔ سنا تھا کہ آج بادشاہ کی سواری نکلے گی۔ اپنے مقدور کی آزمائش کے
لیے یہاں کھڑی ہو گئی۔ کہ دیکھوں میرا لوہا بھی سونا ہو جاتا ہے یا نہیں؟

چوبدار نے واپس آ کر یہ حکایت ہوبہو حضور ہمایوں تک پہنچائی۔ حکم ہوا کہ
وہ لوہا ہم سے اشرفیوں سے بھر دیا جائے۔ حکم کی دیر تھی۔ اُس بڑھیا کو فوراً شاہی
تک ہاتھوں ہاتھ پہنچا دیا گیا۔ جہاں اُس کے طرف تاہن پر سے گنا ہن کا عمل کیا گیا +
وہ اسی آصف الدولہ کا حق ہے لکھنؤ بہار سے بعد کسی دوسرے کا نام پکارا جاتا؟

علوم و فنون قدیمہ کے اعتبار سے ہندوستان میں ایک صدی سے زیادہ کا
عرصہ گزرتا ہی تھا کہ لکھنؤ اور حیدرآباد میں اُن کا تنزل بہت تدریجاً سے جاری تھا
اور بہت حیدرآباد اگر ایسی حالت پر قائم بھی رہتا تو جائے تعجب نہ تھا۔ کیونکہ بفضلہ وہاں
کے اولو العزم نواب اپنے ملک و قوم کی بہتری کو ہمیشہ مدنظر رکھتے چلے آئے ہیں۔ اور
علوم و فنون کے معین رہتے ہیں۔ مگر لکھنؤ کے لیے یہ امر باعث فخر ہے کہ باوجود اسباب
تنزل پیدا ہو جانے کے یہ سرزمین کاملین کو پیدا کرتی ہے اور اسی طرح شاید پیدا کرتی رہے گی

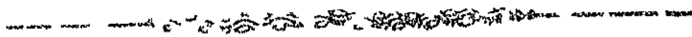
میں یہ نہیں کہتا کہ لکھنؤ میں ہوائے کمال ایک ہی طرح چلتی رہی۔ ہاں تغیر ہوا
اور ضرور ہوا۔ وحشت کمال کی شادابی کے ذرائع بالکل مفقود ہو گئے۔ اس حالت پر بھی
شگوفے پھوٹے۔ مگر اس زمین خشک کی فطرتی نرمی اُن کے رنگ و بو کو اچھی طرح ابھارنے
میں ناکامی ثابت ہوئی۔ بلکہ بہت سی کمزور کونپلیں زمانہ کی گرم ہوا کی تاب نہ لا سکیں اور
نکل نکل کے مرجھا گئیں۔ چارہ کیا تھا۔ یہی سواد ہند کی قسمت +

لکھنؤ کمال شناس جو پایۂ تخت تھا۔ اب اُجڑا ہوا ہے۔ قدر دان نہ رہے۔ مفقود ہیں کمالات کی عملی قدر نہیں کرسکتا۔ لیکن کمال حاصل کرنے والے افراد ہیں اور باوجود اس کے کہ بے زری کا ایک بھاری پتھر اُن کی راہ روکتا ہے مگر اُن کی رفتار جاری ہے۔ اور اپنی جگہ یہ سوچ کے مست ہیں کہ

سخی کا اگر ہاتھ پورا نہ اُٹھا　　فقیروں کا بوریا ہی بھلا ہو رہا ہے

اب لکھنؤ اہلِ کمال کی کانِ زر نہیں۔ جو قابلِ قدر نفوس اس وقت ہیں غنیمت ہیں۔

ذیل میں رشید کے بند مرثیوں کا انتخاب ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے



انتخابِ مراثی

(مطلعوں کی فہرست)

خلق میں موردِ الطافِ الٰہی ہے علی

(بند ۱۱۳) در حالِ امام حسینؑ

دہم ماہِ محرم کو قیامت آئی
شب عاشور گئی صبح شہادت آئی
سپہ شام سے تیر آسکے یہ نوبت آئی
پیشوائی کو قضا تا در دولت آئی
مستعدِ مرگ پہ ہر صفدر و غازی اٹھا
کہ مصلّے سے محمد کا نمازی اٹھا

طلوعِ صبح اور بہار

آمدِ صبح تھی اللہ کی قدرت کا ظہور
محو تھے طاعتِ معبود میں سب وحش و طیور
نظر آنے لگی ہر چیز جو نزدیک تھی دور
جیسے سیل آتی ہو اس طرح سے بڑھتا تھا نور
آشنا بحرِ سماوات کے سارے ڈوبے
موجزن نور کا دریا ہوا تارے ڈوبے

قدرتی مناظر اور لطافتِ نظم

وہ ہوا سرد وہ سامانِ سحر چار طرف
اوس میں چھائے ہوئے شاخوں میں ثمر چار طرف
وہ نہائے ہوئے سارے گلِ تر چار طرف
تر کیے بھیگے ہوئے شبنم سے شجر چار طرف
جس نے جس جا کا کیا قصد وہیں پر پہنچا
کثرتِ گل سے نہ اک قطرہ زمیں پر پہنچا

اب ہیں سیدھے وہ شجر خم سے جو تھے کاہیدہ
دیکھے نرگس نے عجائب وہ جو تھے نادیدہ
گل ہیں جیب جیسے ہو معشوق کوئی فہمیدہ
برگِ گل سایہ میں بالیدہ ہیں سبھی بالیدہ
دھوکا ہو گیا ہر ایک چمن جائے بہار
پھیل کر سایہ ہوا خیمۂ لیلائے بہار

ایسی ہریالی میں ساتھی نہیں جس کا ثانی
اس میں پوشیدہ کسی بحر کی ہے طغیانی

صفحہ دھویا ہوا ہو کھینچے جو نقشہ مانی
گل کی پتی بھی گرے تو نکل آئے پانی

شرح پھولوں سے عیاں خون ٹپکنے کو ہے
ساغرِ گل سے مئے رنگ چھلکنے کو ہے

داغ الفت نہیں بلبل کے جگر پر بھی ہیں گل
سب ہیں پر پھل بھی ہیں ہر ایک شجر پر بھی ہیں گل
سر دیوار بھی گل باغ کے در پر بھی ہیں گل
اب تو گل پاؤں کے نیچے نہیں سر پر بھی ہیں گل

ایسی کثرت کبھی دیکھی نہ سنی پھولوں کی
آسماں بن گیا پھولوں کا زمیں پھولوں کی

ہیں تو منہ شجر باغ میں تیاری ہے
ہر شجر آئینہ ہو یہ حکم نیا جاری ہے
آج کل فصل بہاری بھی گرساری ہے
عکس سے باغ کے دیواروں گلکاری ہے

منہ نقابوں سے ہیں سب اہل حیا کھولے ہوئے
گل ہوا کھا رہے ہیں بند قبا کھولے ہوئے

امام حسین علیہ السلام انصار [illegible] اور جانثار جواب دیتے ہیں

باجے بجنے ہیں صف آرا ہی اُدھر لشکر شام
ہیں طلبگار رضا گرد ہیں انصار تمام
بیٹھے ہیں کرسی زریں پہ شہ عرش مقام
آپ منہ دیکھ کے ایک ایک کا کرتے ہیں کلام

اے وفا دوستاں تمہیں ہے مری غمخواری کا
بھائیو تم کو تو دعویٰ ہے وفاداری کا

چھوڑتے ہو مجھے اس وقت میں تم لوگ یہ
ہم نمک خوار نہ ہوتے کبھی قدموں سے جدا
عرض کرتے ہیں کہ اے عزت و آبروئے وفا
آج عزت ہماری ہے کہ ہوں آقا پہ فدا

خلق میں لاکھ برس کا بھی جو سن آئے گا * اس سے بہتر نہ کوئی مرنے کا دن آئے گا۔

تنہائی حسین

بعد انصار عزیزوں کی جو باری آئی
آج تک ذکر ہے یوں جرأت شہادت پائی
شاہ کو حیدر صفدر کی وغا دکھلائی
کٹ گئے بھانجے فرزند بھتیجے بھائی

دو پہر کوئی مونس تھا نہ شیدائی تھا
بس فقط آپ تھے اور عالم تنہائی تھا

امام حسین بہنوں کو اطلاع دیتے ہیں اور عالم یاس میں ہمکلام ہوتے ہیں

رو کے ارشاد کیا اے مری غمخوار بہن
کوئی دم اور ہوں میں بیکس و تنہا ہے بہن
مجھ سے سب چھوٹ گئے میرے مددگار بہن
اب مرے حلق پہ چلنے کو ہے تلوار بہن

وقت آیا ہے وہ نزدیک کہ لٹ جاؤ گی
جلد مجھ بیکس و ناچار سے چھٹ جاؤ گی

محبت خواہر بہن کا جواب

بولیں پیارے ترے بھائی کے صدقے جاؤں
دل کا جو حال ہے اس وقت کسے دکھلاؤں
خشک ہیں پھول سے لب پانی کہاں سے لاؤں
چل کے میں تیرے عوض برچھیاں تیغیں کھاؤں

پھر وہی رونق گلزار یہ گھر ہو جائے
مجھ کو موت آئے مگر تیری بلا رد ہو جائے

امام عالی مقام گہوارہ علی اصغر کے قریب آتے ہیں اور پیاس سے جاں بلب دیکھ کر اُس شش ماہہ کو طلب آب کی غرض سے میدان میں لانے کا قصد فرماتے ہیں۔

ماں کی محبت فرزند شیرخوار

کہا بانو نے بہت خوب ہے شاہ دلگیر
ان میں جو ہو سب کوئی اور مرا بچہ ہے صغیر
لیکن اک عرض کروں جو ہو میری تقصیر
دو سہ آتے ہیں فوج ستمگار سے تیر

شہ نے فرمایا کہ خود تیر ستم کھاؤں گا
ان کو دامن میں چھپائے ہوئے لے جاؤں گا

میدان علم اور سوال آب

نکلے خیمے سے محمد یاس سلطان انام
لیکے ہاتھوں پہ بڑھا یا طرف لشکر شام
دشت میں ایک بلندی پہ کیا آ کے مقام
کھول کر منہ علی اصغر کا کیا شہ نے کلام
آل کی دیکھ لیں اور سوکھے ہوئے لب دیکھیں
تم میں جو صاحب اولاد ہیں وہ سب دیکھیں

[illegible]

رو دیئے بعض پشیماں ہوئے بعضے بے پیر
رنگ اچھا نہیں کر قطع کلام شبیر
حرملہ سے یہ عمر سعد نے کی یہ تقریر
اس ستمگر نے بڑا ظلم کیا مارا تیر
ہائے جس دم جگر و دل فاطمہ سے تیر جدا
حلق اصغر کا چھدا نانا سے شبیر جدا

منقلب ہو گیا ہاتھوں پہ وہ تشنہ پناہ
دیکھ کر حرملہ کی سمت کہا آہ بے فدا
صبر نے روک لیا آ گئی تھی لب تک آہ
یہی لازم تھا یہی چاہیے سبحان اللہ
تشنہ لب آئے ہیں اب اس کو ہوا ہی دیتے ہیں
پانی جو مانگے سوا اس کو یوں ہی دیتے ہیں

کہہ کے یہ اصغر باوفا کو سلایا لاشے پہ
غیظ آیا تھا کیا رحم کہ ٹالا شہ نے
رہ گئے لیکن بہ گیا زور سے نالا منہ سے
یاد کر اس ننھی سی گردن سے نکالا شہ نے
نکہت غنچہ گل بھی کہ چمن سے نکلی
روح بھی تیر کے ہمراہ بدن سے نکلی

کر کے نیا لحد روئے بہت سرور دیں
ٹیک کر تیغ کمر سے ہو گئے خود خاک جبیں
فاتحہ پڑھتے تھے اور شہ عرش نشیں
روئے تربت کی طرف تھے کہ دل تھام کہیں
تم گئے ہم بھی ہیں دنیا میں مسافر اصغر * مرتے جاتے ہیں خدا حافظ و ناصر اصغر

امام آمادہ جنگ ہوتے ہیں

کہہ چکے یہ تو نظر کی سوئے لشکر کی — غیظ سے دیکھا تو سپہ شام کی پیچھے سرکی
ہوگئی اور ہی کچھ شکل شہ صفدر کی — آنکھوں سے جھانکنے لگی مستی حیدر صفدر کی
دل سے تا سر کے ٹھہرانے کو سینا پوچھا
زلفیں آراستہ کیں منہ کا پسینا پوچھا

رجز پڑھا

کی جو شمشیر علم مثل ہوا وہ سن سے — ناگیں گورو کی تھیں لپٹی ہوئی گردن سے
نہ خبر بھی ہوئی تا چرخ گیا یوں رن سے — روح مومن کی نکل جاتی ہے جیسے تن سے
تیز تک کون ہے ہنگام تگ و دو ایسا
اپنے نقادوں پہ نہیں ہو جو سبک رو ایسا

ساتھ اس رخش میں ہیں باغ بہاری کے اصول — پاؤں اس لطف سے رکھتا ہے کہ کھل جاتے ہیں پھول
یہ فرس وہ ہے کیا جس نے مسرت سے قبول — آتے ہی فصل بہار اور ہی کچھ تھے معمول
دیکھنے سے قدم اس رخش کا دریا نکلا
نعل کیا اس کے بندھے پاؤں سے کانٹا نکلا

توسن دوڑا لڑائی حال روانی نظم

غور سے دیکھئے ہے توق وغا اس کا نام — ہاتھ قبضہ پہ جو رکھا تو اوگل آئی حسام
نصرت شاہ میں کرتی تھی اسے عمر تمام — میان کو کاٹ کے نکلی کہ ابھی کیا کام
مرد میداں جو ہو کیا کام ہے گھر سے اس کو
چھپکے جو بیٹھے بہادر نہیں کہتے اس کو

ناگن آمادہ ہوئی زہر اگلنے کے لیے — خون میں غوطے کی ہے ناگ سے ڈسنے کے لیے
رو جیں بیتاب ہیں جسموں سے نکلنے کے لیے — راستے صاف ہوئے جاتے ہیں چلنے کے لیے
جاتی ہے جس کی طرف دوڑ کے وہ گرتا ہے جس طرف پھرتی ہے یہ دست قضا پھرتا ہے

جوہرِ تیغ ہیں یا سینہ کے زخم آئے ہیں / دل میں یاں سوزِ غمِ شاہ کے چھالے ہیں
دوش پر گیسوئے پُرپیچ گرا ڈالے ہیں / ہار پھولوں کے ہیں یا موتیوں کے مالے ہیں

سامنے اس سیف میں جوہر ہی سراسر نکلے
تیغ کیا نکلی فقط میان سے جوہر نکلے

دل کو مرغوب جو ہیں جوہرِ تیغ بُرّاں / اس کی خواہش میں گرے پڑتے ہیں سب پیر و جواں
دیکھ کر اُس کو ہمیشہ رہے اعدائے جاں / ان دُکانوں پہ رہا خون کا سودا ارزاں

یہ وہ بازار ہے جادل نے جسے کھولا ہے
تیغ یہ وہ ہے یداللہ نے جسے تولا ہے

ہے گراں ایسی سنبھلتی نہیں جس کی جھوکیں / تیز دم ایسی کہ سو کوہ نہ جس کو روکیں
شیر دل ایسی کہ گڑ جائے جو اعدا ٹوکیں / سربلند ایسی کہ چھیدتی ہیں فلک میں نوکیں

جاں ستاں ایسی کہ جینے کی قسم لیتی ہے
جانیں لے لیتی ہے اعدا سے تو دم لیتی ہے

جب کیا وار کیا اہلِ دغل بیٹھ گیا / یہ پڑا بوجھ کہ سب فوج کا دل بیٹھ گیا
بولی غصّے سے اجل جب کوئی پل بیٹھ گیا / بے حیا کھانے کو تلوار کا پھل بیٹھ گیا

کیا عجب ہے کہ جو دستِ شہِ صفدر اُٹھے
خلق باقی نہ رہے فتنۂ محشر اُٹھے

ڈرتے ہیں سب اسے کچھ ایسی ادا آتی ہے / ہٹتی ہے پاس سے جب یہ تو قضا آتی ہے
ناز ایسے کہ بسمل کو سکھا آتی ہے / اور اک ہاتھ ہمیں پر یہ صدا آتی ہے

بڑھ کے آب اس کی بلاخیز ہوئی جاتی ہے وہ باڑھ سے ہل کے ہوا تیز ہوئی جاتی ہے

رہا نقشہ امردی

محو تھے جنگ میں کیا پیش سلطان انام | لائے جبریل ادھر وصل خدا کا پیغام
ملک الموت نے پہلو سے کیا جھک کے سلام | ٹھہرنا آنے لگی پہ قلب کو آیا آرام

نشۂ عشق سے سر تا پا اکرم جھومے
دل کو جوش آ گیا سلطان دو عالم جھومے

اصل حیدر کا حالت ساتھ زہرا

لائے تشریف میں پر جو شہ عرش پناہ | آپ کے پالنے والوں کو ہوا غم جان کا
دوڑے جبریل امیں کہتے ہوئے بسم اللہ | باغ فردوس سے باہر نکلی دل زہرا سے آہ

چشم ابو سے بہائی ہوئی نور آہا ست گئیں
قصر میں پا احمد مختار کے سے تاب کہیں

عرش کی دوڑ سے جلدی کہ قیامت آئی | آپ کے پیارے بے لواسہ نے شہادت پائی
کہا سید سے غم و رنج کی بدلی چھائی | بھائی جلد خبر لو کہ وہ ہیں تنہائی

اُس سے للہ اس وقت تجب ابو صاحب
وقت مشکل کا ہے تم عقدہ کشا ہو صاحب

بولیں شبیر سے کہ بھائی کی مدد کو جاؤ | ساتھ کھیلے ہو دل اس وقت ذرا بہلاؤ
اے مری جان اگر قصد دو سر کا پاؤ | زخم کاری ہیں سنبھالے ہوئے یا یک لاؤ

ہنوز نزدیک ہمن جان جو کھونے کے لیے
کہو صدقے گئی ماں آتی ہے رونے کے لیے

اُس کے جینے کی مجھے صبح سے باقی تھی آس | ساتھ جو لوگ تھے سب آ گئے وہ مہر سے پاس
ہو چکے اس سے جدا قاسم و اکبر عباس | جب سے آیا علی اصغر کے فوجی ہوئی یاس

عاشق زار ہمن رنج سے مرتی ہوگی ❀ ہائے کیا جانیے کیا اُس پہ گزرتی ہوگی

ہے ارضِ کربلا سے معلّی جوابِ عرش

۱۲۰ بند (در حالِ امام حسینؑ)

وقارِ ارضِ مقدسہ

ہے ارضِ کربلا سے معلّی جوابِ عرش
پاسکے نہ اس کی گرد کو بھی آفتابِ عرش
ہر ذرہ اس زمیں کا ہے آفتابِ عرش
بس کا غبار اُڑ کے ہوا ہے حجابِ عرش
وہ جائے فخرِ جنّت عنبر سرشت ہے
کیونکر کہوں بہشت کہ رشکِ بہشت ہے

صفتِ آستانۂ روضۂ مقدس

روشن ہے آستانۂ شبیر کس قدر
کہتے ہیں ایک نور کا خطّہ زمین پر
ہو کمٹ کسی کو صاف آتی نہیں نظر
ہاں ہے بہ قدر روضۂ سلطانِ بحر و بر
اعدا نہ آنے پائیں یہاں کید کے لیے
زنجیر در ہے فقط اس قید کے لیے

تعریفِ زنجیر بستہ

زنجیر بستہ دیکھ کے کرتے ہیں سب بیاں
یہ بھی ہے ایک معجزۂ شاہِ انس و جاں
یہ موجِ بحرِ عفو ہے لیکن نہیں عیاں
ہوتا ہے دور سے خطِ پیچیدہ کا گماں
بولا یہ جس کو کاہکشاں کا گماں ہوا
لوحِ جبیں سے خطِ مقدر عیاں ہوا

توصیفِ حوض

تسنیم دیکھے حوض تو ہو قصد ترکِ لاف
ہیں سب کنارے صورتِ آئینہ خشک و صاف
کوثر سے لاکھ درجہ ہے بہتر بلا معاف
پیاسے موئے ہیں پیئے اُتر نہیں خلاف
ہے طور حوض میں مئے بخشش کے جام کا
دھوکا ہے سیڑھیوں پہ لبِ تشنہ کام کا

کلس و گنبد

جنبش نہیں کلس کو یہ ہے شاہ کا ادب
گنبد یہ ہے جھکا کہ ٹھہرتی نظر ہے کب

	سمجھے ہیں اُس کو قبۂ نور الٰہ سب	پہلے یہ تھا سفینۂ شاہا ہوا کرا ہے
	نقشہ ہی بحر قدرت حق کے حباب کا اُس کو رنگا ہی کاٹ کے رنگ آفتاب کا	
پردہ	پردہ چھپا ہوا ہی ہی ہر مثال ہی اماں والدین کا سب کو خیال ہی	نشہ یہ حزیں کے دامن پہ ہلال ہی اُڑتا ہی کب یہ وہ جلوے فرشتہ کار ہی
	پردہ بندھا ہی کب نہ گئی شکل آپ کی پیچیدہ فرد رکھی ہی اعمال آپ کی	
زرکی	ہر چند گو زرد شمعی کا سماں ہی پردہ دار ہر ہر بیت بار طرح ہو دل جا رہی خدا	قندیل میں چراغ ہیں کہ آن جھڑتا ہا سمجھیں کبھی ہاتھ اٹھائے بیٹھے ہیں پیچھے دعا
	ہر صحہ ہوا ہی پیاس میں شہ کو مرے ہوئے ہیں ہر لگن میں شمع کے آنسو بھرے ہوئے	
ضریح اقدس	ہی جلوہ گر ضریح شہنشاہ بحر و بر ہیں جالیاں کہ آنکھیں ہیں پہرے ہی باند رکھا	زائر بیان تھے ہیں آس پاس کھڑے ہیں گویا کہ دیکھتا ہی یہ کوئی ادھر
	شبیر تیر کھا کے مرے یہ نشان ہی بے چشم مثبت شہ والا کی شان ہی	
سعادت کربلا ابن قاسم وابستگی	دسویں کی صبح تک شہ عزیز ہوا قربان ناگاہ ایک سمت سے بلند گئی قضا	کم نہ ہوا ہا شاہ کا دیا گر تھا کوئی رہا نہ پاس بجز ذات کبریا
	ساری بضاعت شہ ابرار لٹ گئی تھی دوپہر قریب کہ سرکار لٹ گئی	

تنہا جو فاطمہ ہیں یہ اُن پر جو آنچ ہے — جو سو طرح سے کربلا سے آس سے پہنچے
خوں جگر کا بہ گیا سُکھا اُس شہ کے پیچھے — معصوم حسینؑ یا نبیؐ کیا اُس سے پہ پیچھے

صدقے ہو یہاں جس سے وہ وادیِ اکبر گزر گئی
آقا ماں سوچیئے تو سہی کیا گزر گئی

آئے در خیام پہ شاہ ہنستے امام — چلا کے بیکسوں کو کیا آخری سلام
ہر سمت حشر ہو گیا دوڑے حرم تمام — زینب نے آگے بڑھ کے کیا اُن سے کلام

خیمہ میں آ کے مجلس ماتم کو دیکھ لو
ہم تم کو بھائی دیکھ لیں تم ہم کو دیکھ لو

منہ کو بہن کے کان کے نزدیک آپ لائے — کہیں کچھ جو سنیں تو کچھ اسرار حق بتائے
کچھ اپنے دل کا حال کہا زخم بھی دکھائے — کہہ کر اُٹھے بہن تم کو خدا بچائے

جب ہوا کہ دل پہ بہت بھر گئے
خالق ہی ساتھ صابروں کے صبر کیجیے

ظلم اعدا دیکھ کر جناب زینب بھائی سے کس یاس کے الفاظ میں فرماتی ہیں

کیا کیا ہمارے باپ نے پائے رسول — افسوس جلد بھول گئے ظالم وہ بول
پوچھے کوئی کہ ظلم و ستم سے ہے کیا حصول — اچھا انہیں ہماری حکومت نہیں قبول

حاکم نہیں یہ فاطمہ کی بیٹیاں تو ہیں
ہم شاہزادیاں نہیں سیدانیاں تو ہیں

زہرا کے نور عین بہن سے جو جدا ہوا — جھک کر بہن بہن جو کہا ہوش آ گیا
جلدی سے آنکھیں کھول کے بولیں یہ جب بلا — تدبیر کیا کروں کہ نہ تم مجھ سے ہو جدا

[illegible] الّٰھم

خیال جدائی سے حضرت زینب کو غش آ گیا

حاضر عوض تمہارے یہ پسرِ بتول ہے
بچ جاؤ تم تو مجھ کو شہادت قبول ہے

رخصت [illegible] اور حسین کی ساری بہنیں سکینہ

اس ذکر میں سکینہ نے بڑھ کر کہا بابا
فرمایا ہاں خدا کی قسم اے پدر کی جاں
مرنے کا قصد کر لیا کیا اے شہ زماں
وہ کیا کرے نہ جس کا ہو ناصر نہ مہرباں

بولیں بچا کے ظلم سے اعدا کے بھیج دو
بابا ہمیں مزار پہ نانا کے بھیج دو

اہل حرم سے رخصت ہو کے شاہ عالی جناب عازم رزمگاہ ہوتے ہیں

عزم جنگ

گھوڑے کے پاس آئے شہنشاہ لاجواب
بیٹھے فرس پہ تن کے تو پیری میں شباب
جبریل نے سوار کیا تھام کر رکاب
آیا دم زوال بلندی پہ آفتاب

دیکھا سپاہ شمر کو غصے کی نگاہ سے
صاف آئی الاماں کی صدا رزمگاہ سے

توصیف فرس امام

رکھا جو ہاتھ باگ پہ بجلی بنا فرس
چاروں قدم براق کے رفرف کا پیش و پس
چاہا بہت ہوا نے کہ ہو اس کا ہم نفس
اڑ جاتا عرش تک جو نہ کہتے حسین بس

اس گرم رو کے نقش قدم میں جو راہ میں
گویا چراغ جل رہے ہیں رزمگاہ میں

یہ قصد ہے کہ دوں گا نہ فوج شقی سے میں
تھم جاؤں گا اشارۂ شہ حجری سے میں
تلوار کیوں نہ کھینچے صف الٹ دوں ابھی سے میں
جز جدِّ مصطفےٰ نہ رکوں گا کسی سے میں

اس سربلند سے ہی زمانہ دبا ہوا
دانتوں میں غیظ سے ہے دہانہ دبا ہوا

چلتا ہی متصل تیغ وہ دم وقت دار و گیر — آتا ہی رن میں تیر سا گو آرہے ہیں تیر
اُڑتا ہی برچھیوں نیزوں سے گو روکے ہیں تیر پر — سینہ سپر ہی ہر شہنشاہ بے نظیر
کس سے میں سر کو دُم سے ملایا ہی جان کے
کھنچنے میں یوں ملیں گے نہ گوشے کمان کے

توصیف تیغ آبدار

تیغِ علی ہی اور کمر شاہِ خوش خصال — لو وسطِ آسماں میں نظر آتا ہی ہلال
ہی یہ شگوں کہ فوج ستم ہو گی پائمال — جان اب نہیں بچے گی یہ سب کو ہوا خیال
سوئے سقر ہر ایک عدو دوڑنے لگا
مضطر ہوا رگوں میں لہو دوڑنے لگا

دُنیا میں صورتِ تن و جاں ہیں نیام تیغ — گویا ہوں۔ تو زبان و دہاں ہیں نیام تیغ
گل اور غنچے باغ جہاں ہیں نیام تیغ — قلعہ وہ لائے شاہ زماں ہیں نیام تیغ
دشوار ایک دم ہی ٹھہرنا نیام میں
پنہاں ہی جوہروں میں کہ ماہی ہی دام میں

معرکۂ شورش فوج عدو کا حال تباہ

اُکھڑے پڑے ہیں چلتے نشاں گرتے ہوئے — دریائے فوج میں تلاطم بڑھتے ہوئے
ہیں بے حواس بدر و احد کے لڑتے ہوئے — سردار سارے کا سپہ ہٹے ہیں کھڑے ہوئے
ہیبت سے ابن سعد کا دل پائمال ہی
خیمہ میں ڈر سے دوڑ رہا ہے یہ حال ہی

ایک پہلوان جنگ کو آیا اور حیدر کے ہاتھ سے مارا جاتا ہی

وہ جن جو ہٹ گئی ہیں کھڑے ہیں امام دیں — پر طیش سے چڑھائے ہیں کرتے کی آستیں
دامن سے پونچھتے ہیں رخ پاک و جبیں — اُس پہلوان سے ظالموں نے منت جو کیں
کہہ کے چلا کہ سہل سے سر کاٹ لاؤں گا
مشکل کوئی پڑے گی تو میں بھاگ آؤں گا

چمکا کے اُس کو سبطِ نبی نے دکھائی تیغ
جھپکی پلک کہ تا بہ زمیں جا کے آئی تیغ
جھکا لعیں کہ شاہِ امم نے لگائی تیغ
یہ بھی خبر اُسے نہ ہوئی کس سے کھائی تیغ
اُس میں بھرا نہ خون ستمگار دو ہوا
کیا ہاتھ صاف تھا مع رہوار دو ہوا

وقتِ شہادت قریب ہے شاہِ دل فگار یادِ اعوان و انصار فرماتے ہیں کیا بیکسی کا عالم تھا۔

فرمایا مجھ حزیں کی مدد کو کہاں ہو آئیے
قلب و جگر سے نیزے نکالو کہاں ہو آئیے
میری خبر کو لے کے ملائک کہاں ہیں اب
کرتا ہوں تم کو جلد بلاؤں کہاں ہیں آپ
آفت کا سامنا ہے مصیبت کا وقت ہے
ہیں کس طرف رفیق رفاقت کا وقت ہے

جواں ہوئے علی اکبر جہاں سے جانے کو
مسدس ۱۶۰ (در حال علی اکبرؑ)

جوانیِ علی اکبر کا سراپا

۸ / ۱
بلائیں لیتی ہے چہرہ کی زلفِ عنبر بو — سفیدۂ سحرِ عید ہے بیاضِ گلو
ہزار آئینے صدقے وہ مہ لقا پہلو — کمر سے ہیں زورِ علی سے بھرے ہیں بازو
حسد کا نام نہیں جس میں وہ سفینہ ہے
صفا ہے جس پہ دلِ شاہ پہ وہ سینہ ہے

[illegible] — حدیث ہے جبھی چہرہ آیا حافظِ قرآں
[illegible] — ستارہ چاند کے ماتھے پہ سجدہ کا ہے نشاں
عیاں تمام قیافہ ہے شہِ رسالت کا
رگوں میں خون کی جا مادہ امامت کا

حضرت علی اکبرؑ کی جوانی اور دین کی مشق اماں کا استفسار اور اس پر جوابِ امام کا [illegible]

سلیقہ [illegible] سکھانے لگے — ہر ایک کو قدر اندازیاں دکھانے لگے
ہوا جو [illegible] لگے — دلاور جتنے کہتے تھے وہ سب سکھانے لگے
اُمنگ دل کی جوانی کے ساتھ بڑھنے لگی
کمان کھینچنے لگی آسمان پہ چڑھنے لگی

جو پوچھتی تھی کبھی بانوئے امامِ زماں — یہ کیا سبب ہے کہ ہوتا ہے جنگ کا ساماں
تو عرض کرتے تھے یہ دست بستہ اے اماں — تمام اہلِ جہاں ہیں فدائے شاہِ زماں
عوض میں شاہ کے شمشیر و تیر کھائیں گے
لہو پدر کے پسینہ پہ ہم بہائیں گے

ماں کی ستائش
وہ کہتی تھیں کہ مرے وضعدار کیا کہنا — سپاہیوں کو شجاعت ہے پھولوں کا گہنا

اور سلسلہ ہی اُن کی شجاعت کا اظہار

اُمیدوں کی بر آنا ہی خون کا بہنا — ہمیشہ سینہ سپر آگے باپ کے رہنا
جو تم نے پائی ہے عزت وہ کس نے پائی ہے
یہ بات وہ ہے جو کُنبہ میں ہوتی آئی ہے

بعد شہادت حضرت عباس حضرت علی اکبر رخصت میداں چاہتے ہیں اور امام حسین علیہ السلام اُن کو جواب دیتے ہیں

پھرے جو لاشۂ عباس سے امام انام — قدم پہ گر کے لگے رونے اکبر گلفام
کہا حسین سے کیوں کیا ہے مجھ سے کیا نام — یہ جان تک ہے نثار آئے گر تمہارے کام
وطن سے دور ہوں آفت نصیب ہوں بیٹا
جہاں کا شاہ ہوں اور یوں غریب ہوں بیٹا

کہا انہوں نے کہ ہیں آپ صاحب ہمت — میں چاہتا ہوں کہ اب مجھ کو دیجیے رخصت
تڑپ رہا ہوں پئے سیر گلشن جنت — رہی نہ تاب جو دل کو تو بولے حضرت
خیال مرگ تو اے میرے لال ہے تم کو
پدر ضعیف ہے یہ بھی خیال ہے تم کو

ہمارا حق بطرف ہے یا نہیں اے لال — تمام سخت جگر رن میں ہو گئے پامال
نہیں بیان کے قابل جو کچھ ہے دل کا حال — تم ایسے وقت میں رخصت کا کرتے ہو سوال
مقام غور ہے انصاف سے گزرتے ہو
ذرا سمجھ کے کہو کیسی باتیں کرتے ہو

ہم ایک بات بتائیں اگر کرو منظور — جو دل میں جنگ و جدل کا ہے شوق بیٹے غیور
تو ان سے لڑ کے نکل جاؤ ایک سمت کو دور — ہمیں تو کام ہے اُمت کا جان دینگے ضرور
ہمارے قتل کی احباب کو خبر دینا
پدر کی لاش کو پھر آ کے دفن کر دینا

بعد حصول رخصت جہاد علی اکبر خیمہ میں تشریف لاتے ہیں اور حضرت زینب سے رخصت اکبر الفاظ میں مخاطب ہو کر جو الفاظ فرمائے ایسا زبان اور طور گفتگو قابل دید ہے

محل سرا میں جو داخل ہوئے علی اکبر
زمیں پہ دھوپ میں بیٹھی تھیں زینب مضطر
سیہ سلام جھکے سینہ سے لگا یا سر
کہا میں سمجھی طلب گار دن ہو دلبر

بدن سے رخصت جاں کا پیام لائے ہو
پھوپی کے دل کی تڑپ دیکھنے کو آئے ہو

نثار ہو گئی بچہ چاہا تم کو سمجھانا
کہ ہو خدا کی عنایت سے عاقل و دانا
ابھی نہ ذکر جدائی زبان پر لانا
پھوپی کی قبر بنا لو تو مرنے کو جانا

ہوئی ہے بار جوانی جو مرنے جاتے ہو
ریاضتیں مری کیوں خاک میں ملاتے ہو

خدا کی شان ہو دل سے آپ خود مختار
چلے ہیں مرنے کو میداں میں باندھ کر تلوار ۲
لحاظ اب نہ کروں گی کہ آ رہا ہے پیار
کہوں گی لفظ خلاف مزاج لئے لذا

یقیں ہوا کہ محبت کا تم کو جوش نہیں
برا نہ مانیو واری کہ مجھ کو ہوش نہیں

جوان ہوتے ہی کیسے بدل گئے فی الفور
کبھی تمہاری محبت کا مجھ سے تھا یہ طور ۳
نگاہ اور ہے آج آنکھ اور تیور اور
تم اور ہو گئے بیٹا۔ اگر کرو کچھ غور

یہ حال تھا کبھی دم بھر جدا نہ رہتے تھے
وہی ہو تم جو پھوپی جان مجھ کو کہتے تھے

میں کون ہوں مجھے پہچانتے ہو تم واری
ابھی سے بھول گئے میری محنتیں ساری
ہوئے جوان ملی فوج شہ کی سرداری
یہ سب ہوا تمہیں گویا سفر کی تیاری

[illegible]

حیات ہے سب وبالی ہیں

اگر یہ جانتی میں تم کو پالتی نہ کبھی
اگر یہی تھا تم الفت نہ مجھ سے کرتے کبھی
مگر جہاں میں بھتیجہ کو چاہتے ہیں سبھی
کرو یہ وعدہ تو دیتی ہوں تم کو رخصت ابھی

کہ ساتھ ساتھ سوئے فوج شام جاؤں گی
تمھیں ہٹا کے میں شمشیر و تیر کھاؤں گی

مزاج میں ابھی بچپن ہے اسلئے یہ سوال
مٹانے بیٹے ہو کیوں نقش ریاض بتول
یہ ضد نہیں ہے کہ مرنے کے واسطے ہو ملول
بھلا بسی ہوئی بستی اجاڑنے سے حصول

پھوپی کا نام ہے میرا نہ غم سوا ہوگا
بتاؤ ماں ابھی سن پائے گی تو کیا ہوگا

یہ ضد ہے چاہنے والوں کے ساتھ گویا بیر
بھلا میں غیر ہوں ماں باپ تو نہیں ہیں غیر
ریاض خلد میں جانے کو چاہتے ہو سیر
یہ جان لو کہ ہے دونوں کا خاتمہ بالخیر

خیال کچھ تمھیں بابا کی بیکسی کا نہیں
مثل ہے سچ کہ جہاں میں کوئی کسی کا نہیں

کوئی جواب دو قربان ہو گئی بیٹا
جو بستی پہلے تھی ویران ہو گئی بیٹا
میں کہتے کہتے ہلکان ہو گئی بیٹا
وہ صحبت اگلی پریشان ہو گئی بیٹا

ستم زدوں کو نہ تدبیر ہے نہ چارا ہے
بس اب خدا کا سہارا ہے یا تمہارا ہے

[illegible]
ٹھہر گیا طرف لشکر ستم جانا
[illegible]
ہوا ہے بھوک میں منظور برچھیاں کھانا

[illegible]

مادر علی اکبر کا تاسف

یہ سن کے بانوے ناشاد بے قرار آئی — ہوا ملال کہ ہونٹوں پہ جان زار آئی
سیہ لباس پہن کر وہ سوگوار آئی — قریب زینب ناچار اشک بار آئی
پسر کو دیکھ کے خاموش بھی رہا نہ گیا
بس ایک آہ تو کی اور کچھ کہا نہ گیا

اٹھے سلام کو یہ گر پڑیں وہ تھرا کر — اٹھیں سنبھل کے تو چلائیں اے علی اکبر
کہاں کا قصد ہے قربان ہو گئی مادر — جگر پہ تیر چلایا دل پہ چل گیا خنجر
مرے دکھے ہوئے دل کو عبث دکھاتے ہو
مجھے بھی لیتے چلو گر جہاں سے جاتے ہو

ذرا پھوپھی کی طرف میرے لال دھیان کرو — رضا کے واسطے منت نہ میری جان کرو
بس اب سوا نہ محبت کا امتحان کرو — جئیں گی بعد تمہارے نہ یہ گمان کرو
قریب مرگ ہیں کیا دیکھتے ہو حال ان کا
تمہیں قبول ہے صدقہ گئی ملال ان کا

[illegible]
سکینہ دیر سے روتی ہے پاس اپنے بلاؤ — بلائیں لینے دو اے لال منہ تو آگے لاؤ
غضب ہے ماں کو ضعیفی میں تنہا چھوڑتے ہو
تھکے ہیں پاؤں ہائے تو ہاتھ جوڑتے ہو

جواب علی اکبر کا حضرت حسین

جھکا کے سر کو یہ کہنے لگے علی اکبر — پھوپھی کا آسرا ارشاد تو بجا ہے مگر
[illegible]

حالتِ اہلِ حرم وقتِ وداعِ علی اکبر

چلے محل سے جو ہمراہ سرورِ ذیشاں — گلے سے لپٹی پھوپھی اور کمر سے لپٹی ماں
پکارتی تھیں کہ ہوتا ہے آج گھر ویراں — خدا کی حفظ میں تم کو دیا علی کی ماں
بہارِ باغِ علی و بتول لے کے چلے
یہ پالنے کا صلہ ہے کہ داغ دے کے چلے

امام حسین جوان بیٹے کو مرنے کی اجازت دیتے ہیں اور جوشِ محبت سے ملاقاتِ آخری کی رسم ادا فرماتے ہیں

جھکے حیا و ادب سے گئے بڑھ کے کہا یا — خدا گواہ ہے طاقت کا مجھ میں نام نہیں
لگا دو سینہ سے سینہ تو دل کو ہو تسکیں — ملا دو ہونٹھ مرے منہ سے او جبیں سے جبیں
لحاظ ہو تو کنول کب دلوں کے کھلتے ہیں
بس اس طرح سے ملو جیسے دوست ملتے ہیں

یہ کہہ کے جانبِ مقتل چلے شہِ والا — بس آ گئے بڑھ کے ہمشکلِ مصطفےٰ نے کہا
ندا یہ ہے آپ مرے ساتھ آئیے بابا — کہا امام نے مجبور ہوں میں اے بیٹا
[illegible]
یہ مجھ کو دل لیے جاتا ہے میں نہیں جاتا

حضرت علی اکبر کی جنگ

نہیں ہے تاب یہ اعدا کو ہے گلہ دل کا — خطر کی موج نے لوٹا ہے قافلہ دل کا
لہو گلے سے نکلا یہ حوصلہ دل کا — جگر کا خاتمہ ہے یا فیصلہ دل کا
عجیب عالمِ حیرت میں سب جفا جو ہیں
کہ ایک تیغ سے چورنگ دونو پہلو ہیں

صفتِ تیغ سر شکن

دکھا رہی ہے چمک تیغ کی نیا انداز — دکھائی دیتی ہیں رو میں جگہ کرتی ہیں پرواز
نکل چلا کوئی بچ کر جو تفرقہ پرداز — لگا کے آپ نے اوچھا سا وار دی آواز
کہ زخمِ تیغِ دو دم یادگار لیتا جا ٭ نشانی ایک تو اے بدشعار لیتا جا

ایک پہلوان بے باک کو آنا ہزار و جنا علی اکبر کے ہاتھ سے مارا جانا

بڑھے تو مورچے لشکر کے دم بدم توڑے
ہزار ہا سرِ کفار گھم سے گھم توڑے
پھریرے پھاڑ کے پھینکے اُدھر علم توڑے
دکھا دی بت شکنی مثلِ جدّ صنم توڑے
خدا کے بعد ہیں ہم سب کو یہ بتاتے ہیں
ہر ایک وار پہ تکبیر کہتے جاتے ہیں

یہ سن کے آئی حیا تیغ لی بڑھا جلاد
گزند اُن کو نہ پہنچی تو یوں کیا ارشاد
غضب ہے ہاتھ لگانے لگا ستم ایجاد
تجھے تو کچھ ہنرِ جنگ خاک بھی نہیں یاد
سیاں ہے صاف کہ دونوں پہ خوف طاری ہے
فرس کو روک سنبھل اب ہماری باری ہے

وغا سے دل ترا نامرد ہٹ نہ جائے کہیں
ذرا جو ظلم نہ ہٹا چہرہ کٹ نہ جائے کہیں
نظر نہ پھیر اُدھر دھیان بٹ نہ جائے کہیں
جھجک کے تیغ سے گھوڑا الٹ نہ جائے کہیں
فرس کا ہے یہ پس و پیش ایک یوں سمٹتا ہے
بڑھا کے آگے خوف سے کیوں دبکے پیچھے ہٹتا ہے

بڑھے یہ کہہ کے لگے چلنے جب تیغِ دوآ
لعیں کی انگلیاں کٹ کٹ کے گر پڑیں تیغ بھی
گھٹا یہ زور ہوا دست پاچہ ظالم شقی
ہوا یہ حال لگی گرنے ہاتھ سے تلوا
کہا انھوں نے جو زخمی اُدھر کلائی ہوئی
یہی تھی ضرب یہ اللہ کی بتائی ہوئی

*

ہوا دا شرطِ محبت تو جزا ملتی ہے

بند ۸۴ (درحالِ امام حسینؑ)

علمِ سرِ حسینی کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے یہ ... اور اندازِ بیان کا ملاحظہ کیجئے

آ گیا خیمہ سے باہر شہِ مرداں کا خلف ۔ سب کو جوش آگیا جرّار بڑھے تیغ بکف
لشکرِ شام میں بجنے لگے ہر سو دف ۔ فوجِ اسلام میں تکبیر ہوئی ہر صف
شیروں کے نعرۂ شیرانہ سے رن ڈول چکا
پسرِ شیرِ خدا سبز علم کھول چکا

علمِ شاہ کی میداں میں ہے طرفہ بہار ۔ بجلی گرتی ہے لعینوں پہ چمک کے ہر بار
آنکھیں ہیں بند گرے پڑتے ہیں [illegible] ۔ صبح کے وقت کا ہونے لگا ہر جا اظہار
دم بدم یاں سے جو پنجہ کی ضیا جاتی ہے
دھوپ جنت کے درختوں پہ نظر آتی ہے

یہ علم فوجِ حسینی کے چمن کی ہے جان ۔ باغِ اسلام کی رونق ہے یہ پنجہ کی ہے شان
پانچ پتّی کا کھلا پھول یہ ہوتا ہے گماں ۔ گلِ صد برگ کی مانند سنہری ہے نشان
غازہ رنگ اس کا بنا حور کے چہرے کے لیے
پھول کھلنے لگے ہر باغ میں سہرے کے لیے

پوچھا ہمبن کو نہ ہمراہ ہوا دہ لی ۔ گرد کی پاک کہ تھی پانی کی چادر میلی
گل و بو کے لیے تشبیہ ہے محمل لیلی ۔ پھول کھلنے کی خبر آئی کہ خوشبو پھیلی
علمِ شہ کے پھریرے کی یہ زیبائی ہے
عطر ملنے کے لیے فصلِ بہار آئی ہے

اس کا حامل ہے بہارِ چمنستانِ دہر ۔ ہیں قوی ہاتھ کہ بے تیغ ابھی چھین لیں شہر

پھل سے شمشیر کے ظاہر ہے کہ قبضہ میں ہے نہر — لہر ہے سبزہ بھی بھیری ہے کی کہ سبزہ کی لہر

شوق میں دور سے غلماں بھی اسے چومتے ہیں
جب ہوا جاتی ہے جنت کے شجر جھومتے ہیں

دل سے فرمایا غم و رنج کے دفتر کھولیں — جس سے ہم چھٹ گئے جی کھول کے اُن کو رو لیں
چھائی ہے گرد الم آنسوؤں سے منہ دھو لیں — موت نزدیک ہے اب بہنوں سے رخصت ہو لیں

حال اندوں کا ہے اندوہ سے کیا دیکھ آئیں
سب کو پھر ایک نظر چل کے ذرا دیکھ آئیں

آرزو تھی کہ سرِ تربتِ اصغر روتا — کبھی قاسم کے لیے کہ پیٹا کر روتا
بہرِ عباس علم دار بہ مضطر روتا — ملتی مہلت تو ہر ایک قبر بنا کر روتا

رہتا مشہور سدا خلق میں وہ غم کرتا
ہاتھ بے کار نہ ہوتے تو میں ماتم کرتا

کہہ کے یہ اور پریشان ہوئے سلطانِ عرب — آ کے خیمہ میں صدا آپ نے دی زینبا
کہو بیبیوں سے کہ ملنے کے لیے آئیں سب — کریں عابد سے بیاں دل میں جو کچھ ہو مطلب

اب امامت انھیں ہونے کو ہے ہشیار کریں
قصد ہے اپنی سکینہ کو ذرا پیار کریں

دوڑیں سیدانیاں خیمہ میں ہوا حشر بپا — سب کی سب آئیں قریں برہنہ سر برہنہ پا
شور ماتم ہوا جب بیٹھنے لگے شہ بے ریا — غم یہ تھا زینبِ مضطر کے نہ تھے ہوش بجا

پاؤں پہ جھک گئیں الفت سے دعائیں دیکے
گرد پھرنے لگیں بھائی کی بلائیں لے کے

انصار امام شہید ہو چکے ہیں تشنگی اعدا سے مبارز طلبی کی ہے آپ خیمہ میں پھر رخصت ہونے آئے ہیں

شہ نے فرمایا کہ اس وقت جو اکبر ہوتے
اے بہن اس سے سوا اشکوں سے منہ کو دھوتے
اور اس طرح سے سر پیٹ کے ہم تم ہوتے
یا گلا کاٹ کے خود جانِ حزیں کو کھوتے
مل گئی خاک میں کیا چاند سی صورت اُن کی
حشر تک ہم کو نہ بھولے گی محبت اُن کی

[illegible]

وہی سیرت مرے نانا کی وہی شکل تھی
جو قبا پہنی ہوئی بیاہ کا گویا خلعت
[illegible]
ایسی پائی تھی رسولِ دو جہاں کی آواز
کان میں آ رہی ہے اُن کی اذاں کی آواز

نور آنکھوں کا اُجالا وہ مرے گھر کا تھا
خانداں میں مرے جو تھا وہ نہایت یکتا تھا
اس سبب سے نہیں کہتا کہ وہ فرزند تھا
گو حسین سب تھے مگر یہ تو غضب کیا تھا
اک پیمبر سے سوا اپنا پسر دیکھ لیا
سُنتے تھے حضرت یوسف کو مگر دیکھ لیا

خیمہ سے برآمد ہونا حضرت کا

شاہِ دیں روتے ہوئے خیمہ سے آئے باہر
[illegible] طرف کوئی آیا نہ نظر
چھوڑ کے خیموں سے بدن سیکڑوں صدمے لے کے
[illegible] میں گھوڑے [illegible]
ایسے [illegible]
تھامی زینب نے رکاب آ کے تو اسوار ہوئے

صفت آمد جوش لجام

جم کے بیٹھے تو دلِ رخش نے راحت پائی
شہ کو یاد آ گیا وہ قوتِ بازوئے بھائی
پاؤں میداں میں پٹخا یا تو قیامت آئی
جوش میں لانے لگا اور غمِ تنہائی
[illegible] جوانی کا [illegible]

اسپ پہچان گیا عزمِ شہنشاہِ انام ۔۔۔ کر لیا قصد کہ پامال کرے فوجِ شام
کام وہ سیکھے تھے جب تک رہ جائے نام ۔۔۔ یوں چلا وہ چلتی ہے جس طرح حیدر کی حسام

شیر کی طرح قریبِ صفِ ہیجا پہنچا
ایک ہی جست میں تا فوجِ ستم جا پہنچا

تلوار کی تعریف

یہ چلی تیغ یہ وہ جلسے کی قسم کھانے لگے ۔۔۔ ابر وہ جس سے قضا اپنی صفت چھپانے لگے
آب ایسی ہے کہ ہر جوہر میں موج آنے لگے ۔۔۔ لچک ایسی ہے کہ دل برق کا تھرانے لگے

کب کسی شمع میں وہ جلوہ گری پاتی ہے
کہیں شیشہ میں اُترنے کے یہ پری تھمتی ہے

نورِ عینِ علی اس وقت جو ہیں مائلِ حرب ۔۔۔ وہی نقشہ ہے یہ بعینہ انھیں کی ہے ضرب
جسم چھلنے کے لیے مہر بھی ہے جانِ غضب ۔۔۔ زلزلہ بیچ میں ہر گام ہے تیغ عجب

کروبیں خوف سے رہ رہ کے بدلتی ہیں پہلو
یا علی کہہ کے ہر اک بار سنبھلتی ہے زمیں

رہتے ہیں جتنے فرس فوجِ ستمگر کی طرف ۔۔۔ اُن میں ہے شور کہ ہیں تیغ رہ پیش شہ کی طرف
جس پہ گر پاتی ہے تیغ اس کا نشاں صاف ۔۔۔ سن کے جا بیٹھتی ہے قبر کی ہر جانب تلف

خوف اس مرتبہ ہے جان چلی جاتی ہے
اُٹھی تلوار کے چلنے کی صدا آتی ہے

فوج میں ہر ضرب پہ تیغ یہ کہتی ہے پکار ۔۔۔ گرد اٹھتی نہیں اس طرح کہ اٹھتا ہے غبار
پر بچھاتے ہیں جبریل کہ کٹتی ہے زمیں ۔۔۔ غل فرشتوں میں ہے سر پہ آسماں اٹھتی ہے

اس قدر دھوم ہے یہ خوف کہ شش جہت سے ہے * آسماں ٹھنکنے کو چاروں طرف اک شور ہے

ساقی نامہ

ساقیا اب تو میں اک جام لبالب لونگا
جس طرح پہلے دیا ہے مجھے پھر اب لونگا
ایک دو دارہ کبھی ہو اگر تو بھلا کب لونگا
جام کیا شیشہ و خم [illegible] سب لونگا

ساقیا تجھ سا سخی خلق میں زنہار نہیں
جانتا ہوں کہ تجھے دینے میں انکار نہیں

دم بدم صورتِ دریا کرم ہاتھ بڑھے
نزع میں نشہ سے مملو ہوں آنکھوں کے [illegible]
سیکڑوں جام چڑھا جاؤں تیوری نہ چڑھے
سم خدا ایسی پیمبر ہیں لکھے نہ پڑھے

بعد اللہ و نبی ایک تجھے مانتے ہیں
دین اپنا تجھے ایمان تجھے جانتے ہیں

اس کے پینے سے نہیں ہوتی شکایت کوئی
نہ پیے یہ تو نہ مقبول ہو طاعت کوئی
کہ پہنچتی نہیں عصیاں سے اذیت کوئی
اس سے بہتر نہیں دنیا میں عبادت کوئی

سجدہ ہر بار کروں مطلبِ دل پا جاؤں
دیئے جا جام میں تسبیح پہ گنتا جاؤں

شہادتِ امام اور گریہ [illegible] صاحبہ

ہو گئے ذبح شہِ دیں گئی ہر سمت خبر
گھر سے مقتل کو چلیں شہ کی بہن پیٹتی سر
ہو گئے سب حرمِ پاک زیادہ مضطر
بند آنکھیں کرو ایک شخص پکارا بڑھ کر

آبرو جاتی ہے ہو غالب ہر غالب کی
بیٹی آتی ہے علی ابنِ ابی طالب کی

پہنچی نزدیک جو شبیر کے وہ شیدائی
ہائے چلتی رہی میں تم نے شہادت پائی
رو کے چلائیں کئی مرتبہ بھائی بھائی
تم کو گھیرے ہوئے ہے بیکسی و تنہائی

نئے انداز سے یہ دشمنِ دیں لوٹتے ہیں
ماں سر کھلی تن پہ نہ ردا ہوں بھی کھینچ لیتے ہیں

کربلا میں وہ ہم ماہِ محرم آئی
بند ۱۰ (در حالِ عون و محمدؑ)

آمدِ بہار اور پردۂ شاعری میں تمہید

نہ کسی سے خبرِ حالتِ یکسر بدلی
باغِ عالم کی ہوا اور ہوئی رُت بدلی
شہر لا آپس میں بہار آنے کی سب بدلی
بوندیاں پڑ رہی ہیں چھائی ہوئی ہے بدلی
تختۂ گل تر ہوئے پیڑوں کو جواں کرتا ہے
آبیاری چمن آرائے جہاں کرتا ہے

نام ساماں ہے اب بے سروسامانی کا
باغبانوں کو یہ موقع تھا نگہبانی کا
ٹوٹے فوارے بھی اور زور بڑھا پانی کا
نام گلزار میں رکھتے نہ پریشانی کا
ہوں میں زینت کا سبب صاف یہی کہتی ہے
آج کل پتوں میں سنبل کے چھپی رہتی ہے

باغباں کو ہوئیں مشکلیں آسانی میں
ہے عبث گیسوئے سنبل کی نگہبانی میں
پھول بنتے ہیں حبابوں کی جگہ پانی میں
لاکھ جمعیتِ خاطر ہے پریشانی میں
کشتی آکے کبھی تھم سکتی نہیں دھارے پہ
گر کے گل شاخ سے ٹھہرے نہیں فوارے پہ

حسینؑ کو انصار کے بعد [illegible] شہادت ہوئے دیکھ کر حالات سب کے فرزندوں کو بھی جوش آیا نصرتِ حسینؑ پیدا ہوا اور آپس میں یوں ہمکلام ہوئے

رنگ یہ دیکھ کے گھبرا گئے زینب کے پسر
چل کے اماں سے کہو شہ سے کہیں بلوا کر
مشورہ کرنے لگے وہ گلِ باغِ جعفر
ہم کو مل جائے رضا پہلے فدا ہوں شہ پر
آج ہر اک گلِ اُمید سینے گا بھائی
دیکھنا کوئی ہماری نہ سُنے گا بھائی

کہا چھوٹے نے بڑے بھائی سے ہاں چلیے
سنیے تو دیکھیے کیا کہتی ہیں اماں چلیے

عون و محمد کی سعی علم کی لینے کا شناس واسطہ اک لاش کی حضرت امیر علیہ السلام

اذن وہ دیں تو حضور شہ ذیشاں چلیے
پھر سوئے باغ بیاباں حرم و فرحاں چلیے
پہلے سے فکر ہے جاہ و حشم بھی کیجے
گر مناسب ہو تو کچھ ذکر علم بھی کیجے

دونوں اس کے جو گھر میں گئے بولیں ہاں آؤ
غرض کی دونوں نے دل کہتا ہے ہرگز نہ چھپاؤ
کہو کیا کام ہے کیوں آئے ہو تم جلد بتاؤ
ہم علم لینے کو آئے ہیں کہا باہر جاؤ
مثل جعفر ہوئے یا جعفر طیار ہوئے
واہ وا خوب علم لینے پہ تیار ہوئے

الکہ صد موت ہیں کیا اتنا رہوں زار و حزیں
اسا صرف دل میں محبت کا کہیں نام نہیں
ہے اگر فکر علم تم کو تو لو جا کے کہیں
کو سے تم دونوں کو کوئی تو کہوں آئیں
جائیں جائیں تو علم لینے کا قصہ جائے
بات رہ جائے جو اس وقت اجل آ جائے

مجھ کو شرمندگی ہے صدمہ تو ہم کیوں آئے
دل میں پچھتاتے تو اب جگر ہم کیوں آئے
چھوڑ کے خدمت سلطان امم کیوں آئے
رنج ہوتا ہے مجھے ذکر علم کیوں آئے
اب ہے ضد مجھ کو کہ تم دونوں کی ضد دیکھوں گی
بھائی دیں گے بھی اگر اب تو نہ دینے دوں گی

[illegible]

لو شہنشہ سے وراثت کا اگر ہو دعویٰ
منتقل کر گئے خود شاہ رسل یہ عہدہ
تم کو کس بات پہ بیٹھے ہیں یہ جعفر کہتا ہے بابا
دلبر حیدر کرار ہیں سلطان ہدا
وہ بھی وارث ہے طلب بھی نہ اگر پاوے گی
گر خدا چاہے گا عباس کو دلواؤں گی

ہے غضب میرا خجالت سے نہیں اٹھتا سر
کیا تعجب ہے جو غصّے نے کہا ہو جا کر
سامنے سب کے کہا تم نے جو تھا مدِ نظر
ہو گئی ہوگی انھیں علمِ امامت سے خبر

مجھ کو شرم آتی ہے کیا سامنے جاؤں شہ کے
بات میری گئی تم چھٹ گئے بچہ کہہ کے

لاکھ سمجھایا انھیں کچھ نہ ہوا آہ صد آہ
ہے مشیت سے خدا کی شہِ والا آگاہ
باتیں یہ تم کو نہیں لائق ہیں سمجھے نہیں آہ
منہ سے اب نامِ علم کا نہ نکالو للہ

جتنے ہیں فخرِ شجاعانِ عرب مانگیں گے
رشتہ جن جن کو نبی سے ہے وہ سب مانگیں گے

عذر کیا ان سے کیا جائے گا کچھ بتلاؤ
ہے علم ملنے سے بہتر کہ شہادت پاؤ
ایسے بچے نہیں لازم ہے کہ سمجھاؤ
سرخ رو خوں میں ہو ڈوبے ہوئے گھر آؤ

پاس ایک ایک کا کس طرح کیا جائے گا
عہدہ یہ ایک ہے کس کس کو دیا جائے گا

گوشۂ چشم سے کرتی تھیں جو غصّے کی نظر
یہ خبر سن کے چلی آئی سکینہ مضطر
ہاتھ جوڑے ہوئے وہ کانپتی تھیں تھر تھر
آبدیدہ انھیں دیکھا تو کہا گھبرا کر

شاہ کو اُن سے ہے عشق اور وہ عاشق تم کے
ہم دلا دیں گے تمھیں اپنے چچا سے کہہ کے

مسکرا کر کہا زینبؑ نے کہ ناجی، جی نا
آبدیدہ ہیں تو کیا رو دیں گے تو کیا ہوگا
وہ برا مانیں گے ہرگز نہ چچا سے کہنا
تم تو ناداں ہو سمجھتی نہیں مطلب ان کا

ظاہراً گو علمِ شیرِ خدا مانگتے ہیں * اسی پردہ میں یہ مرنے کی رضا مانگتے ہیں

عون ابنِ زینب کے
محمد سے ہی جو
ستّے دو نو
صاحبزادہ
سے بھی جو شہ
کا کمر بستہ ہیں
کہ جا سکینہ
آتی ہیں اور
کہا دیکھنے آ
کے بیٹھ کر میا
عباس کی
سعادت کا
وعدہ فرماتی
ہیں مگر جناب
زینب انکار
فرماتی ہیں

بچوں نے ماں سے ... کی تقسیم علم و تیغ

کی یہ چھوٹے نے جسارت کہ کہا اے اماں ہیں نبی اسکے وراثت تو ہماری ہے عیاں
سچ ہیں یہ شبہہ کیجو آپ نے جواہر ہیں نانا دادا اسکے کل تھے ہمیں آج نشاں
یہ بڑے ہیں انہیں لشکر کا علم دیجیے
ہم لڑیں فوج سے اک تیغ وہ دم دیجیے

اسی سلسلہ میں ... کی مزید تقریر

اک تعجب ہوا کہ آپ نے حیرت سے نظر دفعتاً حال ہوا ہو کوئی جیسے ششدر
ہاتھ مارا کبھی سینہ پہ کبھی زانو پر بولیں میں سمجھی تھی لینا ہے علم رد و کد
اب کھلا مرتبہ میں سب پہ یہی غالب ہیں
ذوالفقار اسد اللہ کے یہی طالب ہیں

رنج ظاہر ہو وہ چشم اور وہ ابرو کیوں تانیں ہر خوشی مرنے کی تو آنکھوں میں آنسو کیوں ہیں
کیوں پریشان ہو بکھرے ہوئے گیسو کیوں ہیں تم ہی کہا باتوں ہیں یہ درد کھلو کیوں ہیں
قاسم و اکبر و عباس کو سمجھا دونگی
پہلے ان سب کو رضا مرنے کی دلوا دونگی

امام حسین ... علم ... اور عباس علمدار ...

گفتگو کچھ ابھی باقی تھی کہ آئے شہ دیں پھر کے فرزندوں کی جانب علم سونپنے لگیں
اور اشارہ سے کہا جا یہ ٹھہرنے کی نہیں دیر کے بھائی کو نشان دے یہ شہ عرش نشیں
کمریں جراروں کی اے ماہ لقا بند ہوا
وہاں صفیں بند ہو گئی ہیں تم بھی پرا بند ہوا

کر کے تسلیم چلا وہ دل و جان حیدر تھی وہی شان علی اور وہی تھے تیور
در پہ حاضر ہوئے انصار یہ پہنچی جو خبر سب سے پہلے آپ علم کر کے سلامی باہر
فوج اسلام کی تسلیم کو آمادہ تھی * فضہ پردہ کو اٹھائے ہوئے استادہ تھی

اپنے بابا کی طرح یہ بھی ہیں خالق کے ولی ہو گا اک حشر بپا آج جو تلوار چلی
رشتہ ان دونوں کا ہے سلسلۂ زمانہ جلی علم احمد مختار کے حامل ہیں علی

عزت اس سبز پھریرے سے بڑھی عباس کی
حضرت خضر عباس کے لیے جاتے ہیں

بڑھ گئے دل علم اس شان سے باہر آیا سر تبسیر یہ عباس کے تھے سایا
فوج اللہ و پیمبر کو مسلح پایا واں سے سبقت ہوئی حکم آپ نے بھی فرمایا

سینے تانے ہوئے سب صاحب شمشیر بڑھے
وجہ غصہ کی ہوئی زخم لگے شیر بڑھے

جا کے ایک ایک سے میدان میں کی خوب وغا خود گئے خلد میں اور نار میں فوج اعدا
لڑ کے مسلم کے یتیموں نے بھی کی ان میں قضا جلد گھر میں گئے جان ول بنت زہرا

کہہ کے سب حال کہا شہ سے گزارش کیجے
وقت ہے وعدہ وفائی کا سفارش کیجے

کہا زینب نے کہ ہاں مجھ سے ابھی لو رخصت جلد سامان کرو چاہیے بشتابی عجلت
کرو مظلوم حسین ابن علی کی نصرت آج تم زور سے تلوار کے لے لو جنت

مختصر کہتی ہوں جاتی رہے یا جان رہے
وضع کا اپنے بزرگوں کی ذرا دھیان رہے

سنتی ہوں ان میں کئی لاکھ ہے فوج ناری تم بھی دونوں مدد شہ کی کرو تیاری
بس اسی دن کے لیے تھی مری محنت ساری آج کے مرنے کو مرنا نہ سمجھنا واری

دیکھو قرآن میں شہیدوں کا بڑا رتبہ ہے ۔ پاس اللہ کے ہیں رزق انھیں ملتا ہے

بعد شہادت انصار عون و محمد کفرین سے معرکہ رخصت چاہتے ہیں اور وہ بھی نصرت حسین کے لیے اجازت دیتی ہیں محمد کے دل شہادت کی اور محمد شہادت بیان قرآنی ہیں ۔

کہہ کے یہ زلفیں سنواریں اٹھا دل ولولوں سے
تھا سیاں دل کے دھڑکنے سے غضب کا ہی اثر
آنکھیں جو آپ نہیں چہرے پہ ٹکی تھی یاں
دبتی جاتی نہیں پہنچے کے یہاں کو ابھار

دھیان آیا کہ گلی امید اب سیکھنے کو
کمر پہ بند ہو لیکے ٹکڑی ہو گئیں خود ملنے کو

صفت رہوار

دوڑی یوں ساتھ ہوا آگاہ گری گاہ تھمی
پیسبک چلنے لگے گرد سموں پر نہ جمی
خاک کب اڑتی تھی تعظیم کو اٹھتی چلی تھی
دیکھنے والوں کی سانس آنے میں رکتی تھی

راہ میں طائر وہم ان کو نہیں پاسکتا
تیز رو ہیں کہ پسینہ بھی نہیں آسکتا

سر قلم کرنے میں سمجھی کہ بہت ہے تعجیل
شاہزادوں کا ہے حکم اس کی ہو جو بے تعمیل
ہوتی جاتی ہے جو بہت فنا فوج ذلیل
دونوں ہاتھوں سے ذرا کام کریں رائل

ہیں اگر ہوش پراگندہ درستی نہ کریں
تیز دستی کا یہ ہنگام ہے سستی نہ کریں

ورود کی والیں چلوں پر تیغ کی [illegible] اظہار

آئیں جھپٹیں ڈھونڈ کے جو تیغا نے جو زینت نگہیں
بولیں غنچہ ہے کہ لو یاں گئے پھر تیغ بہ ہیں
شور اٹھا جو سنا اپنی جگہ سے اٹھیں
کہہ کے یہ بنتا چلی آ گئیں ہو کے قریں

آرزو تھی کہ یہاں لاشہ پر لاشہ دیکھوں
میں تو دونوں کی لڑائی کا تماشہ دیکھوں

بولیں جس دم وہ کہ یکبار سے نشاں جا ب
اب تو بچہ پیر سے ہیں جدا تیغ ہے سر شمشیر
دیکھو دم بھر میں کئے دیتے ہیں لاشوں کے ڈھیر
سب بزرگوں کے تصدق میں ہیں یہ دو اور دلیر

ہو گئے ہاتھ قوی نام جو دو ہیں سیدہ [illegible] دونوں بچوں نے جوانوں سے قلم جہان [illegible]

جب جھپٹتے ہیں تو فوجوں پہ تو فرماتی ہیں ماں / واہ واہ اے مرے بچو! تمہیں خالق کی اماں
کیجیو جان لڑا کر مددِ شاہِ زماں / دودھ میں بخش چکی تم کو مبارک ہو جناں
ہیں دعا مانگتی ہوں فضل خدا کا ہو جائے
جس لیے تم گئے ہو کام وہ پورا ہو جائے

فوج اعدا کے ان بچوں کی دہشت ابن سعد کا خطاب اور پہلوانوں کا جواب۔

پہلوانوں سے بن سعد لعین نے یہ کہا / فوج تو بھاگ گئی ہم خیر ہوا ہے تمہیں کیا
دو لوان چھوٹے سے بچوں سے نہیں کرتے وغا / گود میں ان کو اٹھا لاؤ جو رکھتے ہو حیا
وقت آ جائے تو رستم سے بھی لڑ لیتے ہیں
لوگ تو گھیر کے شیروں کو پکڑ لیتے ہیں

بولے ہاں لڑتے ہیں جب ہوتا ہے کوئی پیر دلیر / پہلے جو کھا گئے بھوکے جاتے ہیں ان سب کو پھیر
تو کل فوج سے ہم ساتھ ہیں چل کر انہیں گھیر / ہم ہیں روباہ سگ کم وہ اسد اللہ کے شیر
کفر و اسلام میں اول سے کبھی میل نہیں
جنگ ان بچوں سے دشوار ہے کچھ کھیل نہیں

یاحسین ابنِ علی آپ کا ذاکر ہوں میں

بند ۱۰۹ (در حالِ امام حسینؑ)

امام حسینؑ کی ... تشریف آوری

نکلے خیمہ سے مسلح جو شہنشاہِ عرب
اُٹھے سجادوں سے تیغیں لیے انصار ہی سب

بعد تسلیم پھرے گرد تمام اہلِ عرب
شاہ کے ساتھ بڑھے سیر کو وہ پیش و عقب

سب ہنسے آئی نظر ایسی فضا مقتل میں
گلشنِ فاطمہ کے پھول کھلے جنگل میں

صبح کے دلفریب مناظر اور کیفیتِ چمن۔ یہ چند بند اُن تمام شاعرانہ خوبیوں سے مملو ہیں جن پہ مغربی خیال کے حضرات کو وجد آتے ہیں۔ یہاں معلوم ہوتا ہے کہ رشید کی طبیعت کو قدرتی مناظر سے کس قدر حیرت انگیز لگاؤ تھا۔

وہ سماں صبح کا اور جانوروں کا وہ غل
جب ہوا آئی جھٹکنے لگا زلفیں سنبل

پھول جو کھل رہے ہیں نغمہ سرا ہیں بلبل
ٹھنڈی ٹھنڈی وہ نسیم اوس میں ڈوبے ہوئے گل

وہ ہوا دشت میں آئی کہ چمن پھول گئے
پیاس دو روز کی سب غنچہ دہن بھول گئے

اے خوشا وقت کہ عالم میں ہے پیدا ناگہاں
پھر سنواری گئی ہے زلفِ پریشانِ بہار

سب مہیا ہیں وہ چیزیں جو ہیں شایانِ بہار
صحنِ گلشن میں ہیں گل دست و گریبانِ بہار

پھول سب کھلنے لگے شاخ ہر اک پھلنے لگی
گر کے حباب اوس تھمی سرد ہوا چلنے لگی

وہ دلا رہے دکھاتا ہے روانی پانی
باسما عکس سے سبزے کے ہے دھانی پانی

کچھ جو کہتا ہے تو موجوں کی زبانی پانی
جس طرف دیکھو نظر آتا ہے پانی پانی

آتش افروز کوئی چیز نہ تھی پانی میں
رنگِ گل کا جو کٹا آگ لگی پانی میں

ایسی مستانہ روش بادِ بہاری آئی
آنکھ نرگس کی کھلی باغ میں آہٹ پائی
اُلجھے پھولوں میں قدم سبزہ پہ ٹھوکر کھائی
شاخیں جھومیں کہ ہر اک نخل نے لی انگڑائی

بلبل اس درجہ ہوئی شاد کہ چلّانے لگی
سبزہ لہرانے لگا نہر میں موج آنے لگی

کتنی دلچسپ ہے سبزہ کے نکلنے کی بہار
ہے زمیں باغ کی گویا کسی نو خط کا عذار
کیوں صبا دوڑتی پھرتی ہے میانِ گلزار
سبزہ خوابیدہ ہے کہہ دے کوئی نرگسِ ہُشیار!

بے خبر ہے یہ عیاں ہے نظرِ بلبل سے
آنکھیں سب سینکتی ہے آتشِ رنگِ گل سے

کچھ عجب صحبتیں غنچوں کی ہیں چٹکی بولی
منع بلبل نے کیا چھیڑ کسی نے جو لی
جو فقیر آگیا بھر لی زرِ گل سے جھولی
بولی نرگس تجھے کیا بحث ہے تو کیوں بولی

بات جاتی رہے یہ حسنِ بیاں کھل جائے
کہیں ایسا نہ ہو سوسن کی زباں کھل جائے

وہ ہوا باغ کی وہ ابر کا آنا جانا
حسن اور عشق کا ہر ایک جو ہے دیوانا
قصہ بلبل کا کہیں گل کا کہیں افسانا
کثرتِ گل یہ ہے مشکل ہے خزاں کا آنا

راستے بند ہیں پھولوں کا مزا تازہ ہے
دہنِ غنچہ ہے یا باغ کا دروازہ ہے

امام حسینؑ عالم یاس میں کھڑے ہیں کوئی مونس و یاور نہیں کہ قاصد صغرا نمودار ہوتا ہے آپ اُس سے اپنی دُور اُفتادہ بیٹی کا حال دریافت فرماتے ہیں قاصد امام حسینؑ کو دیکھ کے حیرت انگیز لہجہ میں اظہار تاسف کرتا ہے اور پھر حال صغرا کہتا ہے

چوم کر پائے مبارک وہ ہوا یوں گویا
میں نہ پہچان سکا آپ کو یا شاہِ ہُدا
تھوڑے دن گذرے مدینہ میں ابھی دیکھا تھا
ریشِ اقدس میں سفیدی یہ عیاں ہے آقا
بہت اُترا ہوا ہے چہرۂ انور حضرت
سینکڑوں زخم ہیں اور خون میں ہیں تر حضرت

دل تڑپنے لگا فرمایا کوئی خط ہے لا
بادب اُس نے قریب آکے جو مکتوب دیا
بولے شبیر کہ مشکل سے پڑھا جائے گا
اشک آنکھوں میں ہیں اور ضعفِ بصارت ہے سوا
ہے یہ نامہ غم و حسرت کی نشانی بھائی
حال کچھ اُس کا بیاں کر دے زبانی بھائی

سر جھکا کر کہا اُس نے کہ ہیں بیمار بہت
اب نقاہت سے ہوا ہو گئی ہیں لاغر بہت
ہوئیں گھر بھر سے جُدا بڑھ گیا آزار بہت
سب کی مشتاق ہیں ہے حسرتِ دیدار بہت
منتظر آنے کی ہیں در پہ کھڑی رہتی ہیں
تپ جو بڑھتی ہے تو بے ہوش پڑی رہتی ہیں

مکتوب صغرا لے کے حضرت خیمہ میں تشریف لائے سب بیبیوں کو حال سنایا اور پھر آمادۂ رزمگاہ ہوئے کہ جناب زینب نے روک لیا تاکہ وہ ایک وصیت جناب فاطمہ پوری کریں

بولیں صدقہ گئی گھوڑے سے اُترو آؤ ذرا
مجھ کو یاد آ گئی اک بات بہت خوب ہوا
اُترے گھبرا کے فرس پر سے شہنشاہ ہدا
بیٹھ جاؤ جو کہا خاک پہ بیٹھے مولا

عرض کی ایک بلاکش کا کہا کرتی ہوں
بھائی ۔ اماں کی وصیت میں ادا کرتی ہوں

نزع کے وقت یہ فرما گئی تھیں وہ خوش خو
بے خطا ذر ہیں بچہ کا ترے بھائی کا گلو
آئے جب رخصت آخر کو وہ میرا مہ رو
ذبح کا وقت ہو نزدیک سمجھ لینا تو

جب چلے مرنے وہ محبوس بلا اے زینب
چوم لینا مرے بچہ کا گلا اے زینب

صفت شمشیر حسین

آب ہی حبل فنا دم ہی اک آفت اس کا
جا بجا امید قضا ہے در دولت اس کا
کم سمندر سے نہیں جوش طبیعت اس کا
کھنچنا اک قہر ہے جھکنا ہے اک آفت اس کا

خوف سے اس کے فلک خم ہوا خم ایسا ہے
ملک الموت کی ہمدم ہوئی دم ایسا ہے

چال وہ قہر کی ہے جس سے زمیں ہل جائے
مردے اٹھنے لگیں ہر گور کی منزل ہل جائے
رعب ایسا ہے کہ طاقت نہیں سنبھل جائے
وہ چمک آنکھیں جھپک جائیں ہر اک دل ہل جائے

تیزی ایسی ہے کہ جو برق کو بھی مات کرے
غصہ ایسا کہ زباں کاٹ لے جو بات کرے

صاف کہتی ہے یہ کیونکر نہ سپہ ناز ہوں میں
ملک جان عدو کو پر پرواز ہوں میں
ایک قرآن ہے اور دوسرا اعجاز ہوں میں
وہ خدا کا ہے کلام اور خدا ساز ہوں میں

ذکر دیں اس میں ہے میں دیں کی شیدائی ہوں
اسمیں احکام ہیں اور حکم سے میں آئی ہوں

ساقی سے طلب

ساقیا پہلے جو دی تھی وہی تیری ایسی دے
ہو مئے عشق بہت دے مجھے یا تھوڑی دے

حشر تک نشہ رہے جس کا شراب ایسی دے
ہاں تجھے اپنی محبّت کی قسم جلدی دے

سہل پینا نہیں اس کا متردد دل ہے
نام لے کر ترا پی جاؤں گا کیا مشکل ہے

طلب امداد

بادہ نوشانِ محبّت کو ترا نام ملا
بعد اُس کے مجھے مدح کا یہ کام ملا

پائی جنّت کہ سند خلعتِ انعام ملا
جب میں آیا تو فقط دُردِ تہِ جام ملا

تو جو بے ہوش بنا دے تو مجھے ہوش آ جائے
تو جو دے بادۂ سرجوش مجھے جوش آ جائے

تو ہی ساقی مرا ہے ساقیِ کوثر ترا نام
خم کے خم آج پلا دے مجھے دے جام پہ جام

کام پینا ہے مرا اور پلانا ترا کام
روح کو چین ہو دل کو مرے آ جائے آرام

تا قیامت رہے عالم میں ترا دَور۔ پلا
جس قدر لطف زیادہ ہو کہوں اور پلا

پارسا بنتِ عنب کو بھی کہیں تکتے ہیں
سیرِ گلزارِ فلک گوشہ نشیں تکتے ہیں

حکم تیرا جو نہیں۔ پھر کے نہیں تکتے ہیں
بیٹھتے ہیں جو مئے دنیا وہ زمیں تکتے ہیں

نشۂ بادۂ کوثر کو سوا کر ساقی
دے مئے خم غدیر اُس میں ملا کر ساقی

بزم میں دیکھ کے اندازِ کرم بیٹھ گئے
شوق میں چوم کے ساقی کے قدم بیٹھ گئے

ذوق پینے کا نہیں تھا وہ بھی ہم بیٹھ گئے
ایک گوشہ کی طرف کہہ کے یہ ہم بیٹھ گئے

جام چلنے کو ہیں سب اہلِ نظر بیٹھے ہیں ٭ آنکھ ساقی نہ چرانا ہم ادھر بیٹھے ہیں

آکے بسلوا لڑنے کو آیا ہوا اور شکست کھا کر فنا ہو جاتا ہے

پہنچے شہ کے قریب آ گیا وہ پاس کے کمک — آگے اک تیر کے پلہ سے تھا وہ مرد کے
لی کماں شانہ سے ترکش سے نکالا ناوک — متصل آ گئے شبیر جھپکتے ہی پلک
ڈور کا حربہ تھا نیزہ کی سناں بھی کاٹی
چلہ بھی تیر بھی ۔ ظالم کی کماں بھی کاٹی

کہا للکار کے لے میان سے جلدی تلوار — کھینچ کر تیغ دو دم کرنے لگا پیہم وار
ٹوٹی تلوار جو اُس کی تو ہوئی اک جھنکار — دست پاچہ ہوا جاتے جو رہے ہوش اک بار
تھا تن و توش بہت اُس کا تو دم پھول گیا
دوسری تیغ تھی ہمراہ ۔ مگر بھول گیا

میرا کلام کیوں نہ صداقت مآل ہو
بند ۱۰۶ (در حال ماتم)

فضل خدا سے معرکے مارے بڑے بڑے — مضموں دلوں پہ نقش کیے جیسے نگ جڑے
میری طرح کسی کی طبیعت بھلا لڑے — مقتول جانیے جو کوئی حرف گر پڑے
میدان نظم میں دم جنگ و جدال ہے
مضمون غیر قتل نہ ہو یہ خیال ہے

مبالغۂ شاعرانہ میدان نظم کی لڑائی اور عجیب تشبیہات

بڑھتا ہوں پڑھ کے نادعلی بہر کارزار — مضموں کے دل سے نیزۂ فکر رسا ہے پار
صورت دوات سے ہوئی ترکش کی آشکار — پیکاں سے قطرہ ہائے سیاہی ہیں آبدار
ہر مد بنا ہے صورت میت کہ دم نہیں
ہر دائرہ ہے خون کی تھالی سے کم نہیں

آفت کا رن پڑا ہے جدھر کیجیے نظر — نقطے نہیں کٹے ہوئے سر ہیں ادھر ادھر
زیر و زبر پڑے کبھی یوں تھے نہ پیشتر — مصرعے دو لخت ہو گئے اک لطف ہے مگر
سارے حروف صف کی طرح ہیں ملے ہوئے
بین السطور زخم ہیں گویا کھلے ہوئے

اس وقت غیظ میں ہے جگر بند بوتراب — چہرے سے بار بار سرکتی ہے نقاب
ہے سامنے کبھی کبھی بدلی میں آفتاب — کچھ کچھ پردہ دکھائی دینے لگا ابر سے حجاب
قرآن میں لکھے ہیں حیدر صفدر کی شان سے
ظاہر ہے کہ ذوالفقار نکلتی ہے میان سے

غیظ امام اور بادل [illegible]

غصہ میں ہیں حضور جو اٹھے ہوئے نقاب — طور غضب دکھاتا ہے زلفوں کا پیچ و تاب

وقتِ جلال ہی تو جہاں کو ہی اضطراب — گھبرا کے چڑھ گیا ہی بلندی پہ آفتاب

حالت ہوئی ہی غیر ہر اک روسیاہ کی
سب کو جلائے دیتی ہی گرمی نگاہ کی

تپنے لگی وہ تربت و تابوت مردگاں — دریا سراب ہوگئے باقی نہیں نمی
پانی کی ہوگئی ہی سمندر میں بھی کمی — اف رے مزاج سرور والا کی برہمی

بارِ غضب کا سب کو یہ عالم دکھا دیا
صحرا کے ہر کرہ کو جہنم بنا دیا

ہی طرفہ شان حال رسالت پناہ کی — ہوگی نہ یہ شکوہ کسی بادشاہ کی
حالت ہی غیر شدت عدوئے سیاہ کی — ہی رعب قہر سے کہ نہیں [illegible] کی

شہ کہتے ہیں کہ فرس پر عتاب ہیں
گردوں پہ ایک پاؤں ہی اک ہی رکاب میں

امام حسینؑ زخمی ہو چکے ہیں کوئی انصار و اعزا سے باقی نہیں کہ ناگاہ جن نمودار ہوتا ہی اور اجازت نصرت چاہتا ہی -

اُس نے کہا کہ اے اسد کبریا کے لال — صدقہ میں آپ کے ہی یہ سب جاہ و جلال
مجھ سے ہو کوئی سر سپیکار کیا مجال — ہیں لوگ ساتھ اگر ہیں لاکھوں کو پائمال

مر جاؤں لڑ کے دشمنان پہ ہر بار ہی مجھے
حضرت کا حال دیکھنا دشوار ہی مجھے

جواب امام کا [illegible] رضائے الٰہی

قربان اُس کے لطف و کرم کے میں ناتواں — اُس کی عطا ہوئی تو وہ پانی نہ تھا یہاں
کچھ تجھ سے اپنی پیاس کا عالم کروں بیاں — دل جل گیا ہر ایک نفس ہی شرر فشاں

گو سلسبیل کوثر و تسنیم پاس ہے
خالق بجھائے گر تو بجھے ایسی پیاس ہے

ابھی تو پیاس کا مجھے اتنا نہیں خیال — پیاسے حرم ہیں سب ہو گئے ان کا ہے ملال
آئے تھے پانی لینے کو عباس خوش خصال — مانع ہوئے یہ ظلم کیا ظاہر تھا ان کا حال
رایت کی چوب خشک نہ تھی تر آہ تھی
سوکھی وہ مشک تشنہ لبی کی گواہ تھی

باتیں یہ کر رہے تھے شہنشاہ نامدار — باجے بجا بجا کے بڑھی فوج نابکار
فرمایا میرے حکم سے جا اے وفا شعار — وہ وقت آ گیا مجھے تھا جس کا انتظار
ساماں کیا شروع سے شیر ذوی شرور نے
دو نو قدم رکابوں میں رکھے حضور نے

توصیف فرس لاجواب

آتش نفس بھی ہے یہ فرس باد پا بھی ہے — قدرت خدا کی آگ بھی ہے اور ہوا بھی ہے
صرصر بھی ہے نسیم بھی ہے اور صبا بھی ہے — شدت کی ابتدا بھی ہے اور انتہا بھی ہے
خلقت ہے اس کی کیا متحیر جہان ہے
اضداد جمع ہو گئے خالق کی شان ہے

باندھ فکر شاعر خوش فکر دور دو — نازک خرام کوہ وقار اور تیز رو
اس کو شباب روح کی طرح لیجیے ہر پاؤ — یوں رکھتا پاؤں شمع کی جلنے نہ پائے لو
شل نگہ پھرے جو کسی پر اثر نہ ہو
محفل میں آ کے جائے کسی کو خبر نہ ہو

صفت تیغ

ہیں کچھ عجیب تیغ کے حالات و آب و تاب — ممکن نہیں ہے [illegible] سارے محالات [illegible] جنگ

آتے ہیں اس کو طرفہ خیالات وقتِ جنگ ۱ ہر اک زبان لاکھ سوالات وقتِ جنگ

فقرہ ہر ایک تیز دمِ کارزار ہے
جوہر پکارتے ہیں کہ یہ ذوالفقار ہے

زندہ اسی کے دم سے ہے دینِ رسولِ پاک
اُڑتی ہے اس کے خوف سے روئے زمیں پہ خاک
نام اس کا سن کے الٹتے ہیں اہلِ ستم ہلاک
کہتی ہے بار بار قضا روحنا الفداک

کیوں ڈر سے آفتاب کا چہرہ نہ زرد ہو
دیکھے جو اس کی آنچ جہنم بھی سرد ہو

ہر ایک طرح ظلم و ستم کا نشاں گرا
کوئی سنبھل سکے یاں سے جو اُٹھا وہاں گرا
ششدر سے روبروئے تیغ ہر اک پہلواں گرا
غل تھا زمیں بیٹھ گئی آسماں گرا

چلتی ہے یوں کہ فوجِ ستم پائمال ہے
قائل ہیں اس کے سب کہ قیامت کی چال ہے

ان ظالموں میں شورِ اماں دم بدم نہیں
ہستی وہ کس کی ہے کہ قریبِ عدم نہیں
تھم جائیں ان میں ایک کے ایسے قدم نہیں
دم اس کا بھر رہا ہے لعینوں میں دم نہیں

دریائے فوجِ شام کی کیا کائنات ہے
اس بحر کا تو گھاٹ قریبِ فرات ہے

جس سے ملی یہ اُس کے گلے سے قضا ملی
بسمل تھے اس قدر نہ تڑپنے کی جا ملی
کٹ کٹ گئی جو راہ میں مثلِ ہوا ملی
جب بام کی کر کے چرخِ چہارم سے جا ملی

وحشت سے آفتاب کا بھی زرد رنگ ہے
عیسیٰ کو ہے خبر کہ قیامت کی جنگ ہے

ہے محو جنگ ناکِ تسنیم و سلسبیل
بھر سپاہ تیغ کا پانی ہوا سبیل
عزت میں ذکر کرتے ہیں جس سر جلیل
اپنے پروں کو دیکھنے لگتے ہیں جبرئیل
گہ ڈر سے دور گاہ محبت سے پاس ہیں
خیبر کا حال یاد جو ہے بے حواس ہیں

کھنچنا بھی اس کا قہر ہے جھکنا بھی ہے ستم
جس دن سے آئی چرخ سے تیغِ شہِ امم
چلاتی ہے اجل کہ غنیمت ہے اس کا دم
یکساں ہے آج تک کبھی تیزی ہوئی نہ کم
یہ وضع دار مثلِ بشر خوش صفات ہے
کہنے کو دو زبانیں ہیں پر ایک بات ہے

سپر کٹیں۔ جدا سرِ اہلِ ستم ہوئے
سب فوج بے نشان ہوئی ٹکڑے علم ہوئے
تیر دوسی پہ ملے ہوئے تیغوں کے دم ہوئے
پوریں جدا جدا ہوئیں نیزے قلم ہوئے
بے آب تیغیں تھیں یہ بدصفات ہیں
پانی نہ اتنا تھا کوئی ڈالے دوات میں

خوف اس کا مثلِ تیغ دو دو کام کر گیا
جب یہ تھمی تو حل ہوا دریا ٹھہر گیا
سمجھا حیات مل گئی جو شخص مر گیا
جب یہ چلی تو زیست کا موسم گزر گیا
یہ گرم رو نظر کی طرح سے جو مڑ گئی
سمٹی یہ وہ تو یا ایک شرر بن کے اڑ گئی

رن پر چڑھا ہے اس طرح شہِ دیں دمِ جہاد
ہے طرفہ چیز تیغِ شہنشاہِ خوش نہاد
چہ بیں یہی ہیں خیمۂ گردوں کی گرد باد
ہے چرخ پہ ہلال زمیں پہ قضا نژاد
کس طرح معجزہ یہ نہیں ساحری نہیں * دریا یہ وہ ہے آب میں جس کے تری نہیں

سب فوج منتشر ہی عجب انتشار ہی — ہی تیغ یا ستارۂ دنبالہ دار ہی
جوہر ہر ایک دیدۂ مردم شکار ہی — قبضہ بھی اس کا تاج سر اضلاع ہی
سب کے سروں پہ چلتی ہی پایہ بلند ہی
ہی ہاتھ میں حسین کے رتبہ بلند ہی

حملہ امام سے لشکر کا حال تباہ ہونا سست ہونا طلبی ایک پہلواں کی اور موت

تھیں سے امام دیں جو سنا شور الاماں — کاندھے پہ رکھی بوجھ کے تیغ شررفشاں
اک سمت کانپ کے اونچا ہوا نشاں — لشکر سے ڈرتے ڈرتے بڑھا ایک پہلواں
لنگر پڑا رکابوں پہ جس دم لعین نے
مشکل سے اس کا بوجھ سنبھالا زمین نے

ساقی نامہ

ساقی کہیں سے کوئی کہ اب دیر کیا ہی آئیے — ہی تیرہ یہ دئی میں اسے جم نما پر لائیے
حسرت میں جان جاتی ہی جلدی مجھے پلائیے — ہوں درد مند دل کے تڑپنے سے ہائے ہائے
ساغر کہاں کا شوق کی تلوار کھائے ہوں
لے ہاتھ میں سبو کہ میں چلو لگائے ہوں

اللہ کا کرم ہی تری ذات ساقیا — برہم جہاں ہی بزم خرابات ساقیا
لیتا ہوں تیرا نام میں دن رات ساقیا — کیا کہنا تیرا اور تری کیا بات ساقیا
واللہ تیرے قبضہ میں دونوں جہان ہیں
تو مہرباں اگر ہی تو کل مہرباں ہیں

شاہ پر ماریہ میں ابرِ الم چھانے لگے

بند ١٠٠ (درحال جناب امام حسینؑ)

شاہ پر ماریہ میں ابرِ الم چھانے لگے
چرخ پہ صبح کے آثار نظر آنے لگے
شب عاشور چلی غم کی خبر پانے لگے
ہر طرف مرغِ سحر دشت میں چلانے لگے
دل جو بھر آیا تو اک آہ بھری حضرت نے
کی ادا اٹھ کے نمازِ سحری حضرت نے

آمد صبح

شان وہ صبح کے آنے کی وہ لطفِ صحرا
گرد ہی رنگ سے معشوق کا چہرہ نکلا
چترِ زر خسروِ خاور کا افق سے چمکا
کسی محبوب کی ہو زر و قبا کا پردا
زعفران کا ہے یہ کھیت اس کا ہے غل خلقت میں
گلِ صد برگ کھلا ہے کہیں جنت میں

طلوع مہر

شمعِ خورشید سے روشن ہے کہ ہر شعلۂ طور
سیل کی طرح لگا پھیلنے ہر سمت کو نور
نئی صورت سے ہوا نوح کے طوفاں کا ظہور
ہر طرف شور ہوا خلق میں یا اللہ دور
ہے یہ طوفان نیا اس میں نئی خوبی ہے
سب نظر آتے ہیں یوں خلقِ خدا ڈوبی ہے

حضرت کا خیمہ سے برآمد ہونا

بزمِ انصار میں جب وہ شہِ ذیشاں آیا
ساتھ احمد کے ہر اک خاصۂ یزداں آیا
دست بوسی کو ہر اک صاحبِ ایماں آیا
حوریں حاضر ہوئیں پابوسی کو رضواں آیا
جوش پر رحمتِ ربِ دوسرا بھی آئی
سب کے سب آ گئے تو جنت کی ہوا بھی آئی

بہار

پھر بہار آنے میں کیا دیر تھی کھلنے لگے گل
وجد میں لائی دو زمستوں کو صدائے بلبل

خود بخود جوش میں آ کھل گئی زلفِ سنبل
مست کرنے لگا کہسار میں طاؤس کا غل

یہاں قطرۂ شبنم سے لہو پاشے ہوئے
کس کی الفت میں ہیں ہیرے کی کنی کھائے ہوئے

پوری امید ہیں اس وقت بہار آجائے
پوری پوری نظر آنکھوں کو بہار آجائے
دل عاشق کو تمنا ہے کہ یار آجائے
پیش خیمہ ابھی آیا ہے بہار آجائے

غنچے سے چٹکیں تو باتیں ابھی ساری بن جائیں
سر میں قافلۂ فصلِ بہاری بن جائیں

کثرتِ گل

ایسی ہے کثرتِ گل جس کا ٹھکانا ہی نہیں
زلزلہ آئے تو اب ہل نہیں سکنے کی زمیں
ڈھیر دم بھر میں پہنچنے کو ہیں تا چرخِ بریں
ہر طرف لوٹ رہی ہیں بلبلیں پھولوں میں

چار مہینے ہی میں بس یہاں پہ چلاتی رہی
آخر اس بھیڑ میں ہر کس کی نظر جاتی رہی

ساقی نامہ

ساقیا جلد بھر لے ترا امیدوار ہوں میں
ہوشیاری ہے بڑا عاشقِ سرشار ہوں میں
غیر سے مانگ کے ناحق ترا لیتا ہوں میں
جام و ساغر مجھے جب تجھ سے طلبگار ہوں میں

کر کے بے ہوش مجھے ہوش میں لانے والا
کون ہے تیرے سوا میرا پلانے والا

خیر پوری نہ کرے میری تمنا نہ سہی
سہی الفت مجھے جی بھر کے نہ دکھلا دے کہیں
نہر بادہ نہ سہی قلزمِ مے یا نہ سہی
نہ سہی جام و سبو و خم و مینا نہ سہی

ساقیا تو ذرہ مقدار کا رتبہ تو ہو
جس قدر نشہ تھا سلمان کو اتنا تو ہو

ہاں مگر اجرِ رسالت کا یہی ہے بادا
کہ عنایت سے مودت جسے خالق نے کہا
اقربا اُن اہلِ قرابت میں تمہی کو پایا
جو طلبگار ہو کرتا ہے خود اللہ عطا

مذہبِ بندۂ تقصیری سے جدا ہے ساقی
تو نہ دے خیر ہمارا بھی خدا ہے ساقی

لشکر اعدا کی تیاری

وہ دھوپ نکلی کہ ہوئے حشر کے آثار عیاں
بیٹھے تھے خیمۂ انصار میں سلطانِ زماں
خبر آئی کہ ہے تیار اُدھر فوجِ گراں
قتلِ سادات کا سب اہتمام کیا رن میں یہاں

باجے بجتے ہیں رن میں دشت کی تھراتی ہے
شورِ ڈنکے کی صدا کوہ سے ٹکراتی ہے

سنتے ہی سب خادمِ سرکار اُٹھے
جانیں آقا پہ فدا کرنے کو انصار اُٹھے
بگڑ کے عباسِ علی تان کے تلوار اُٹھے
دیکھ کے تیور کا غصہ شہِ ابرار اُٹھے

آپ اُس وقت بھی اعدا پہ ترس کھانے لگے
ہاتھ شانے پہ دھر کے بھائی کو سمجھانے لگے

وصف فرس امام

اُس کو خالق نے دیا مرتبہ کیا اس فرس امام
ہے پیمبر کا فرس اور سوار اس پہ امام
گر یہ تشبیہ ہو عفو کرے ربِ انام
وہ ہے قرآن کی سطر اس پہ ہے تحریر کلام

حوریں ہر مرتبہ لیتی ہیں بلائیں اس کی
حلفِ چشمِ ملک دونوں کا ہیں اس کی

جان اس گھوڑے سے ہے اُٹھی علی ہیں
قدم اس کے کبھی چوموں یہ ہوا کو ہے ہوس
ڈر جو ہے آیا تو پامال کرے گا یہ فرس
ہر طرف اس کے یہ صدا دیتے ہیں اعدا بس بس

رحم آتا ہے جو سب خوف سے چلاتے ہیں ٭ آپ باگوں کو بہت کھینچے ہوئے آتے ہیں

تلوار کی [illegible]

فوجیں ہٹنے لگیں شمشیر کے چلتے ہی وہاں ۔ برچھیاں اُٹھیں کہ سرگشتہ ہوئی ہر اک کماں
تیغ بُرّاں کا جو ہاتھ آیا تو ہوا سب کو گماں ۔ یوں ہلی تیغ کہ لہرائے سمندر کی زباں

جلد تر لینے کو اعدا سے سپر آگے نکلی
میاں سے نکلی چمک بعد یہ پہلے نکلی

موج آتی تھی تو [illegible] ۔ آنکھ کیا برق ہو یکساں جو ہو تیرِ شکن
[illegible] ۔ [illegible]

جب کہ رسوا ہوئی ہو خلق میں جس باتی پہ
[illegible] تو سمجھتی ہوں کہ اسی آئی ہوں

کھل گیا صاف کہ ہے تیرِ اجل در پہ جواں ۔ اس کا کھینچا ہے کہ ہے جنگ جدل کا اعلان
سچ یہ ہے قاتلِ ستمگر ہے یہ جو اس کی نشاں ۔ جو ہر اس میں ہے کیا لکھا ہوا یا یہ قرآن

شاہ دکھلاتے ہیں قبضہ شمشیر اُمت کے لیے
سر اُٹھایا واسطے آج شہادت کے لیے

[illegible]

رن میں جب وقت ہوا قتلِ شہِ دیں کا ۔ ننگے سر خیمہ سے زینب نکل آئیں اک بار
سرِ اطہر کی گردن پہ جو دیکھی تلوار ۔ [illegible] آگئیں او ماں جایا

تو سمجھ دل کو مرے دل سے جدا ہے ظالم
وائے ہو تجھ پہ کہ تو دیکھ رہا ہے ظالم

کبھی قبروں کی طرف دیکھ کے دیتی تھیں صدا ۔ ہو غریب اور جسے کہتے ہیں اہلِ قبا
تم میں مہمان ہے دلبندِ رسولِ دوسرا ۔ کس سے فریاد کریں کوئی نہیں باقی رہا

اب طلبگار رہوں امداد کی کس سے جا کر * دیکھو ہم لٹ گئے بستی میں تمہاری آ کر

حال رہنے کا جو کچھ تھا نہ دکھلائے داور — دوڑ کے جاتی تھیں اس سمت کبھی گاہ اُدھر
ساتھ کھینچی ہوئی جاتی تھی زمیں پر چادر — خاک پر بیٹھ کے آخر یہ پکاریں مضطر

مورد رنج و غم و درد و پریشانی ہوں
امتی لوگو خبر لو کہ میں سیدانی ہوں

محضرِ خونِ شہیداں ہے مرا دامنِ دل

بند ۹۶ (در حالِ امامؑ)

صبحِ عاشور کا معکوس اثر

صبحِ عاشور کی جب دشت میں تنویر ہوئی
رن میں جو تیغ تھی وہ اک نور کی تصویر ہوئی
لیلیٔ شب کی جوانی نہ رہی پیر ہوئی
دل جلے سرد ہوا میں ہی تو تاثیر ہوئی
یوں جلے برگِ شجر شور و فغاں اٹھنے لگا
شمع اڑنے لگی آہوں کا دھواں اٹھنے لگا

نمازِ سحر اور مرتبہ اصحاب عبادت گذار

ہوئے مشغول نمازِ سحری میں سرور
سب کے سب ثانیٔ مقداد و تمیم و بوذر
پیچھے صف باندھے ہوئے سارے عزیز و یاور
رتبے میں فرش پہ کعبہ کے مثیلے بہتر
متوجہ سوئے حق قلب و جگر تھے اُن کے
پاؤں تھے فرش پہ اور عرش پہ سر تھے اُن کے

طلوعِ خورشید

تاجِ زریں سے ہوا جب سرِ گردوں پرنور
رنگ وہ چہرے کا وہ مہر کا مشرق سے ظہور
خضر سے جا کہا کر قلزمِ اخضر سے عبور
شیر کا چہرہ نظر آتا تھا سر میں دور
کوئی معشوق بصد شوکت و ناز آتا ہے
سرخ بیرق ہے سمندر میں جہاز آتا ہے

سماں عالم کے بدلے مناظر

پھول کھلنے لگے بلبل کی صدا آنے لگی
غنچۂ گل ہونے لگے بادِ صبا آنے لگی
کربلا باغ کی صحرا میں فضا آنے لگی
ٹھنڈی ٹھنڈی لبِ دریا سے ہوا آنے لگی
سب کے ہر عضو پہ آقا کی طرف مڑنے لگے
زرہیں پہننے لگیں دامانِ قبا اڑنے لگے

سبھوں نے وصلِ بہا آنے کی نکہت پائی
در گل مل گیا جیسے یہ دولت پائی

[illegible] قوت [illegible]
[illegible] پیلا شیشہ [illegible]

[illegible] آ [illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible] جاتی ہے
[illegible] نظر آتی ہے

[illegible]
[illegible]

اسے تو کیسی ہی خزاں آئے [illegible]
[illegible] کے [illegible]

[illegible] آہستہ [illegible] پانی سے
سب [illegible] سناتی ہوئی اڑجاتی ہے

[illegible]
[illegible]

[illegible] سے ہوتی [illegible] رنگ [illegible]
اس طرح سبزہ کو روند [illegible]

تا دیکھیں کہ [illegible] بہار آ کے چلی
تو ہر اک غنچہ کو ہر پھول کو ٹھکرا کے چلی

وہ سماں صبح کا [illegible]
[illegible] فصل بہار [illegible]

تارے [illegible] میں [illegible]
[illegible] نرگس کی [illegible]

کیفیت ایسی [illegible] تھی کہ ادھر [illegible] نہ سکی
پہنچی تو [illegible] ہر گل پہ نظر [illegible] نہ سکی

اس قدر کثرت گل ہے کہ نہیں جس کا حساب
مر سے جاتی ہوں چال کیسا ہے خدا

تھی منہ ہی کی ہر کسی کے یہ کرتی ہے سوال
وصبد فصل بہاری اُٹھتی ہی ہے جواب

شوق [illegible] کا ہے ہر وہم اسی [illegible]
رد زادل [illegible] سے [illegible] [illegible]

آتش گل [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] عشاق [illegible] [illegible]

ہے [illegible] کبھی [illegible] آتش [illegible]
گل [illegible] سے [illegible] کر [illegible]

[illegible] [illegible] کو [illegible] کر [illegible] گل
کہ [illegible] دل کے [illegible] [illegible] گل

قطرہ [illegible] ہے کہ [illegible] [illegible]
جوہری [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

ایں شجر [illegible] سے [illegible] بھی ہوتا ہے [illegible]
[illegible] کا بھلا کون اُٹھاتا احساں

[illegible] فصل بہار کی [illegible] جو ہر [illegible]
کہ [illegible] میں بھی ہونے لگے گوہر پیدا

حال [illegible] [illegible] [illegible]
کبھی اس شکل [illegible] ہے کبھی [illegible]

وصبد [illegible] ہے [illegible] کی [illegible]
کبھی جاتی ہے اُدھر کبھی آتی ہے ادھر

[illegible] میں لوٹتے ہیں [illegible] دیدہ بھی
گرد [illegible] سے [illegible] ہے سبزہ [illegible] بھی

جب [illegible] [illegible] اُٹھ [illegible]
ایک [illegible] سے [illegible] [illegible]

[illegible] بھی [illegible] کے قدم [illegible]
رو کے [illegible] [illegible] سے ہم [illegible]

[illegible] جو [illegible] جہاں [illegible] تھے ✻ آہیں [illegible] کبھی اور کبھی [illegible] تھے

[illegible] عالم [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] اور [illegible]

کبھی دل تھام کے چلاتے تھے اکبر اکبر
مضطرب ہوتے تھے جاتی تھی لاشوں پہ نظر
غم جو عباس کا تھا تھامے تھے ہاتھوں سے کمر
دل کو اس ہاتھ سے اس ہاتھ سے تھامے تھے جگر

جوشِ غم تھا کبھی اُٹھتے تھے کبھی گرتے تھے
دل نہ تھمتا تھا تو بیتاب پڑے پھرتے تھے

کبھی لاشوں کی طرف دیکھ کے کرتے تھے کلام
اے جیالو وہ گلا کٹنے کا آیا ہنگام
ہے زہر اب غم و اندوہ سے ہے کام تمام
لے کے سب میری خبر ہو میں تنہا رہا ہوں امام

مطمئن ہو دلِ خستہ جگر آواز تو دو
نہ اُٹھو میری مدد کو مگر آواز تو دو

امام حسین اور [illegible]

چال اس طرح کی ہے پیری میں کہ دل ہلتی ہے
کستا ہے سینہ سے ہیکل جو ذرا ڈھلتی ہے
یہ ملاوہ ہے کہ نالے سے نہیں ٹلتی ہے
تیر کچھ بھی نہیں کہنے کو ہوا چلتی ہے

نازو اعجاز دکھانے پہ اگر آئے ابھی
چشمِ سوزن سے نکہ بچ کے نکل جائے ابھی

آ کے میدان میں ٹھیرے جو شہنشاہِ زمن
جوش ڈنکے پہ لگی گونج گیا سارا رن
آئی آواز تکبیر اور ہوا شور بزن
دشت سے جو کڑیاں تکبیر ہوئے شیر دہن

واں جو ہر ظالم و گمراہ کے تیور بدلے
یاں بھی شیر اسد اللہ کے تیور بدلے

تیغ حسینی کی تعریف

ہے خدا داد یہ تیغ اس کا بھلا کہنا کیا
آپ کی طرح سے مستعد ہے اس کا بڑھنا
نیل ہے قبضہ پہ کہ نکلا ہے بیابان سے دریا
جو قریب اس کے ہوا اس سے بھی یہ تیغ کہ جدا

تیز چلنے کی صفائی کی کبھی خو نہ گئی * اس طرح نکلی کہ کاٹی بھی کبھی چھو رہ گئی

کس کا سر ہے جو شہِ پا سوئے شمشیر چلے | جس کو جلنا ہو سوئے نار وہ بے پیر چلے
یوں تو تلواریں چلیں شیر سے چلے تیر چلے | تھیں صفیں صاف جدھر حضرتِ شبیر چلے

ایک کو بھی ہنرِ جنگ دکھانے نہ دیا
ہاتھ اٹھا تو کہاں سر بھی اٹھانے نہ دیا

کاٹتی تیغ چلے فوج کا دریا گھٹ جائے | کیا عجب آج اگر قعرِ جہنم پٹ جائے
کہہ دو میداں سے ہر ایک فرشتہ ہٹ جائے | مثل جبریل کوئی پر نہ کسی کا کٹ جائے

اور سروں پر یہ اگر فوجِ شر آجائے گی
سب کو خیبر کی لڑائی نظر آجائے گی

تیغ جب بڑھتی ہے تو موج سی چڑھ جاتی ہے | یہ وہ شعلہ ہے کہ تا چرخ لپک جاتی ہے
وہ ادا ہے کہ ہر اک روح پھڑک جاتی ہے | رگ سے اس برق کی کوندے میں چمک جاتی ہے

پہنچے سر کم کر دیئے ہیں یوں ہی تمام پیکار رہی
لوگ کہتے ہوئے جاتے ہیں کہ تلوار چلی

اے مری ساقیٔ سرچشمۂ کرم عالم کو | اپنا میکش کیا موسیٰ کو بنِ مریم کو
بادۂ عشق تو بخشے سرِ آدم کو | مخمور ان کے لیے دی مئے الفت ہم کو (ساقی نامہ پڑھنے والے کو مست کرنے والا حال اسا)

مستِ اُس روز کا ہم سب کو ابھی باقی ہے
محفلِ دلِ اسلام کا وہ ساقی ہے

کس طرح ہوتی ہے پیاسی نظر دیکھ تو لے | ہو چکا حال یہ شارع دگر دیکھ تو لے
تشنہ دیدوں کو اب ایک نظر دیکھ تو لے | بھر چکا جام مرا پیر مئے دھر دیکھ تو لے

وقتِ آخر ہے خوش انجام سے ناکام نہ لے مجھ بہار خوشیوں پہ وہ آئے اور جام لے

ساقیا بادۂ الفت سے جو شیشے ہیں تہی
مے کشی گر یہ گنہ ہو تو کریں استعمال
کسی عالم میں بہکتے نہیں تیرے میخوار
کہہ دیتے ہوں کہ سمجھانے نہ کوئی ہمارا

جوش میں جام سے شیشے آ کر رہ جائیں گے
نام توبہ کا سن کے تو باہر جائیں گے

اصل کیا غم کی بھلا ساغر و مینا کیا ہے
جز کرم پیر مغاں ساقی تو نے کیا ہے
کر سمجھتا ہوں ساقی اسے کلام کا کیا ہے
کہ کسی اور سے مانگوں مجھے پروا کیا ہے

دل میں آئے گا جو کچھ تو کہ کسی کا بھی میرا
میں ہوں اور یہ سلامت رہے ساقی میرا

گلکدہ

شاعر شیریں مقال ادیب بے مثال سحبان زمان عالی جناب والا لسان الہند جناب مرزا محمد ہادی صاحب عزیز مدظلہ کے نام نامی سے دنیائے ادب بخوبی واقف ہے۔ ممدوح کی غزلوں کا مجموعہ نام گلکدہ دوبارہ چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔ جو لوگ مشتاق گلکدہ تھے اور بہ سبب نایابی نسخہ مستفید نہیں ہو سکے اُن کو اطلاع دی جاتی ہے کہ خریدنے میں تامل نہ کریں ورنہ تیسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا ہو گا۔ قیمت (عہ/)

المشتہر

ابو محمد عزیزیہ منزل اشرف آباد لکھنؤ

عباسؑ نے جب رن کی رضا شاہ سے چاہی

بند ۱۰۴ (درحال جنابِ عباسؑ)

طلب اجازت عباسؑ از امام حسینؑ و افسوس کرتے ہیں اور کہتے ہیں

افسوس ہوا اتنے برس تک جنھیں پالا | وہ مرنے کو جاتے ہیں یہ انداز نکالا
دو روز بھی گھر بعد ہمارے نہ سنبھالا | کس طرح کی فصل آئی ہے اللہ تعالیٰ

جو قوتِ بازو تھے وہی چھوڑ چلے ہیں
تھا جن سے قوی دل وہی دل توڑ چلے ہیں

ہم نے کسی عالم میں کسی کو نہیں چھوڑا | راحت ہوئی یا رنج کبھی منہ کو نہ موڑا
جس امر کی ضد کی وہ کیا دل نہیں توڑا | پر اب غم و اندوہ سے دل ہو گیا پھوڑا

ہم کچھ بھی بجالِ خفگی کہہ نہیں سکتے
لیکن یہ جدائی کا قلق سہہ نہیں سکتے

مراد حال بیمار و طلب لشکر کا سامنا [illegible]

اے بحرِ کرم میر امم اے شہِ جمہور | خادم قدمِ پاک سے ہوتا نہ کبھی دور
ہیں امر وہ درپیش کہ اس وقت ہوں مجبور | خوشنودیِ حق دین کی تائید ہے منظور

اس بات سے خوش ہوتے ہیں ماں باپ بھی آقا
فرمائیں نہ اس باب میں عذر آپ بھی آقا

امام حسینؑ کا حضرت علی اکبر کو منصب [illegible]

ارشاد کیا شاہ نے اے حق کے فدائی | میں بھی تو کسی وجہ سے مجبور ہوں بھائی
ہو کون مددگار جو تم سے ہو جدائی | مجھ کو بھی تو منظور ہے رسمِ وفائی

رانڈیں نہ لٹیں روکنے والا تو کوئی ہو
پردے میں بٹھائے انھیں اتنا تو کوئی ہو

حاملِ علمِ فوج کے ہو تم مرے غمخوار | اکبر سے کہو جائیں سوئے لشکرِ کفار

کی عرض یہ سردار ہیں یا سیدِ ابرار | لازم ہے کہ سردار کے آگے ہو علمدار
پہلے مرے مرنے کا ہو غل فوجِ لعیں میں
مختار ہیں پھر جائیں یہ فردوسِ بریں میں

ان کو طرفِ فوجِ ستم جانے نہ دونگا | پہلے کبھی یا شاہِ امم جانے نہ دونگا
خود جاؤں گا پر سوئے عدم جانے نہ دونگا | میں آپ کے قدموں کی قسم جانے نہ دونگا
مالک پہ یہ صدقہ ہو ملازم سے نہ ہوگا
یہ خوش ہوں کہ ناراض یہ خادم سے نہ ہوگا

ان باتوں پہ آیا جو شہِ دیں کو بہت پیار | لپٹا کے گلے رونے لگے سیدِ ابرار
قدموں کی طرف جھک گئے عباسِ علمدار | شہ نے کہا ہاں اے مرے مونس مرے غمخوار
طاقت ہے نہ اس صبر کا مقدور ہے مجھ کو
جس میں ہو تم خوش وہی منظور ہے مجھ کو

کپڑے جو بدلنے لگا وہ شاہ کا شیدا | زوجہ نے کہا رو کے کہاں کا ہے ارادہ
بولے کہ ہے جنت کی طرف قصد سفر کا | ممکن نہیں میداں سے پھر کر مرا آنا
فوجیں نہ بڑھ آئیں کہیں اندھیر نہ ہو جائے
کہنا ہو جو کچھ جلد کہو دیر نہ ہو جائے

بولیں کہ خدا کے لیے مرنے کو نہ جاؤ | صاحب ہمیں پردیس میں بیوہ نہ بناؤ
روتے ہیں پسر دونوں کو نزدیک بلاؤ | شفقت سے انہیں پیار کرو پاس بٹھاؤ
گھر سے نہ نکل جائیں کہیں بعد تمہارے
مجھ سے یہ سنبھلنے کے نہیں بعد تمہارے

[illegible marginal notes]

چلائیں یہ نرغے کی بلا آتی ہے سر پر
کس قہر کی آتی ہے تباہی مرے گھر پر
اس وقت تو فاقہ ہے یہ دل ہے نہ جگر ہے
روتی ہوں کہ بس ہے وقت اک دیدۂ تر ہے

لونڈی ہوں کسی طرح کی عزت نہیں رکھتی
روکوں تمہیں اتنی بھی لیاقت نہیں رکھتی

آقا سے کہوں آپ انہیں روکیے یا شاہ
میں اپنا گلا کاٹ کے مر جاؤں گی واللہ
فرمایا کہ ایسا نہ کہیں کیجیو للہ
با عزت بھی عزت کا ہے کیا تم نہیں آگاہ

دامن کہیں تم بہر خدا تھام نہ لینا
جاتا ہوں میں اب روکنے کا نام نہ لینا

جب صحن میں آیا وہ ید اللہ کا جانی
کی بیبیوں نے بادہ کے صف مرثیہ خوانی
شاہ شہدا کرنے لگے اشک فشانی
دی مشک سکینہ نے کہ لا دو ہمیں پانی

تھا باتوں میں نادان کی غل آہ و بکا کا
ضد کر رہی تھیں ہاتھ میں دامن تھا چچا کا

یہ کہتے تھے دم بھر کی مصیبت ہے یہ جھیلو
یہ کہتے تھے قربان چچا بچوں میں کھیلو
وہ کہتی تھی پھر جائیو پانی مجھے دے لو
وہ کہتی تھی مانوں گی نہیں گود میں لے لو

گودی میں نہیں تھامے ہوئے ہاتھ چلوں گی
پیاسی ہوں بہت نہر پہ میں ساتھ چلوں گی

پہونچے قدم شاہ پہ چڑھا گھوڑے پہ غازی
سرعت نے دکھائی یہ نئی شعبدہ بازی
باگ اٹھتے ہی طاؤس حباب بن گیا تازی
خود بڑھ گئی کوتہ روِ میداں کی درازی

اعدا سے نگہ صاحب شمشیر نے بدلی ✻ جب سامنے سید آئے نگہ شیر نے بدلی

ساتھ عباس کا صحن میں [illegible] سکینہ کی گفتگو

عزم میدان [illegible] عباس

شوکت وہ علمدار کی وہ شان علم کی   تلوار کی بجلی کبھی ٹھیری کبھی چمکی
آواز بھی آتی نہیں گھوڑے کے قدم کی   پامال ہوئی جاتی ہے سب فوج ستم کی
ہے سرخ زمیں خون جو اعدا کا بہا ہے
وہ شبر کے نعرے ہیں کہ رن گونج رہا ہے

جس نے انھیں ٹوکا اسے زندہ نہیں چھوڑا   فوجیں ہیں پست گرد مگر دل نہیں تھوڑا
اُس ہاتھ میں ہے باگ نہ اس ہاتھ میں کوڑا   جس سمت نظر پھرتی ہے پھر جاتا ہے گھوڑا
کیوں کر نہ اشارے میں ہو وہ خوش سیران کے
گویا کہ لگام اُس کی ہے تارِ نظر ان کے

توصیف فرس حضرت عباس

اُڑتا ہے فرس بن گئے ہیں دامن زیں پر   رکتا ہے کسی سے نہ ٹھہرتا ہے کہیں پر
ہے لعل کا پر تو مہِ نو چرخ بریں پر   کھلتے ہیں گل اُڑتی ہیں قدم رن کی زمیں پر
ہے بلبلِ شیدا ابھی مقرِ جلوہ گری کی
کیا چال اُڑائی ہے نسیمِ سحری کی

اس رخش کو عباس سا اسوار سنبھالے   دوڑے جو صبا ساتھ پڑیں پاؤں میں چھالے
نرغہ میں جہاں پہلوؤں سے مل گئے بھالے   رہوار تھے گویا پر پرواز نکالے
سب شامیوں سے بھر کے طرارا نکل آیا
شب ختم ہوئی صبح کا تارا نکل آیا

صفت شمشیر

شمشیر تیغ کا ہے رشتہ جاں کے لیے مقطع   مہرِ فلک سپہ فتح و ظفر کا ہے مطلع
ہے حق کی عنایت سے کل اوصاف کا مجمع   جوہر کے جواہر سے ہوئی ہے یہ مرصع
ہوتے ہیں رواں قافلے راہ جفا کے * نابیں نہیں جاتے ہیں یہ صحرائے فنا کے

ہے تیز روانی میں کہیں سیل فنا سے
ہر مرتبہ آگے ہے وہ چلنے کی صدا سے
جھک جھک کے گلے ملتی ہے ارباب جفا سے
جب بڑھ کے ذرا چلتی ہے کہتی ہے قضا سے
رکتی نہیں روکیں کہ ستمگار نہ روکیں
اللہ کرے ہاتھ علمدار نہ روکیں

ہر وار میں گر گر کے لعینوں کا پھڑکنا
سناریوں پہ تیغ کے شعلہ کا لپکنا
وہ زیر علم چہرۂ تاباں کا چمکنا
اڑنا وہ پھریرے کا وہ پنجہ کا لچکنا
تھا شور یہ ساعت بھی سدا یاد رہے گی
یہ شان یہ شوکت یہ وغا یاد رہے گی

دو چار صفیں جب تہِ تیغ دو سر آئیں
مسدود جو تھیں جنگ کی راہیں نظر آئیں
اب ہاتھ جو حاضر ہیں اب زور پہ آئیں
یوں انگلیاں لپٹی ہیں کہ قبضہ میں آئیں
وا عقدۂ جاں کر دیا ہر ایک شقی کا
پھل تیغ کا ترشا ہوا ناخن ہے علی کا

بھر بھر کے لہو میں ہوئی تیغ دو سر آتش
کرتی نہیں دریا کو مضرت مگر آتش
ہے ناریوں کا خون کہ شعلہ ہے کہ در آتش
ہے تیغ میں پانی ادھر آتش ادھر آتش
غصہ کی حرارت ہے جو یہ حال ہوا ہے
ہے گرمیٔ رفتار کہ منہ لال ہوا ہے

جس دم وہ گری لاشوں سے رن پاٹ کے اٹھی
فوجوں پہ جھکی یاں تو قریں گھاٹ کے اٹھی
منہ اور کھلا جب وہ لہو چاٹ کے اٹھی
سر کیا ہے زمیں کا بھی طبق کاٹ کے اٹھی
غصہ ہے یہ سرخی ہے کہ یاں خون عدو کی ٭ جوہر نظر آتا ہے ہر ایک کوند لہو کی

اب میان سے تیغوں کو نکلنے نہیں دیتے — عاجز ہے کماں تیر کو چلنے نہیں دیتے
پہلو بھی پیادوں کو بدلنے نہیں دیتے — گھوڑوں پہ سواروں کو سنبھلنے نہیں دیتے
لاکھوں کو دم تیغ زنی ٹوک رہے ہیں
بڑھتا ہے جو غصہ تو اسے روک رہے ہیں

حضرت عباس کا نہر پر قبضہ

عباس کی صورت ہے کہ ہے قدرت باری — دریا کو یہ حیرت ہے کہ پانی نہیں جاری
دامن کی ہوا بن گئی ہے باد بہاری — اب اور قریب آ گئی ہے بڑھ کے سواری
نزدیک جو ہے نہر کلی دل کی کھلی ہے
ہے فوج کی کشتی کہ کنارہ سے ملی ہے

حواس سپاہ میں نعرہ

ہم گھاٹ تک آئے نہ کوئی سامنے آیا — شمر و عمر سعد نے بھی منہ نہ دکھایا
ہم نے تو لڑائی کا مزا خاک نہ پایا — دریا پہ بھی ڈھالوں کا سیہ ابر نہ چھایا
کیا نہر تک اب بھی ڈر سے آ جاتے ہیں تھک کر
تیغوں کی چمک ہے نہ کمانوں کی کڑک ہے

دم لے کے بڑھے حضرت عباس دلاور — رہوار کو ٹھکرا کے گئے نہر کے اندر
دریا کو بہت دور نظر آتا تھا لشکر — دی بڑھ کے صدا مشک کو بھرنے لگے جھک کر
تم یہ نہ سمجھنا کہ پیے جاتے ہیں پانی
لو روکے آؤ کہ لیے جاتے ہیں پانی

اسی طرف سپاہ و طلب

ہر سمت سے چلے آتے ہیں سب اہل ستم کیا — لوٹے ہوئے میدان سے چلے آتے تھے پیاسے
ہے خوف نہ کچھ جان کے جانے کا ہے سودا — پانی کے پہنچنے سے مگر ہو گئی ہے یاس

نیزوں سے جو اہل ستم روکے ہوئے ہیں * یہ مشک سکینہ پہ سپر ہو کے ہوئے ہیں

خیمۂ حسینی میں اطفال حرم و سکینہ کے پیاسے ہونے کی حد درجہ کا اظہار۔

گذرے ہیں کئی روز کہ پیاسی ہے سکینہ
غم ایسے ہیں دل پر کہ مجھے شاق ہے جینا
تیروں سے عوض مشک کے چھانو مرا سینہ
اے ظالموں مجھ سے نہیں چاہیے کینا
ہے قوت دل راحت جاں سبط نبی کی
پیاری وہی بیٹی ہے حسین ابن علی کی

جسم مبارک میں تیر لگنا مشک میں سوراخ ہونا اور عباس کا بچوں کی تقدیر پر افسوس کرنا

کیا کھینچ سکیں ہاتھ ہمیں رنج ہے طاری
تھا فکر میں اُس تیر کی وہ عاشق باری
مشکیزہ میں سوراخ ادھر کر گیا ناری
پانی جو بہا آنکھوں سے آنسو ہوئے جاری
اُس مشک کو اشکوں سے بھگو یا کیے عباس
اُن پیاسوں کی تقدیر پہ رویا کیے عباس

حضرت عباس کا دم آخر امام کو آواز دینا

دی شاہ کو آواز کہ جلد آئیے بھائی
مشتاق ہوں صورت مجھے دکھلائیے بھائی
تکلیف مرے واسطے فرمائیے بھائی
اعدا ہیں بہت پاس ہٹا جائیے بھائی
خادم کا بھی قاسم کی طرح حال نہو جائے
آقا یہ غلام آپ کا پامال نہو جائے

امام حسین کا حالت ملال میں تشریف لانا

اے اہل ستم میرا مددگار کدھر ہے
کیوں بھائیو وہ عاشق سرشاہ کدھر ہے
جس پر یہ چلی ظلم کی تلوار کدھر ہے
یارو مرے لشکر کا علمدار کدھر ہے
بتلا دو کہاں صاحب شمشیر کو مارا
کس وقت مصیبت میں مرے شیر کو مارا

جب شبِ قتلِ شہِ دیں کی سحر ہونے لگی

بند ۱۴۰ (در حال جناب حُرؑ)

شبِ عاشور تردد میں بسر کی حُر نے
عہد و فرزند و برادر پہ نظر کی حُر نے
بیم و اُمید کے عالم میں بسر کی حُر نے
منع عن اپنے ارادے کی خبر کی حُر نے
گو نہ کچھ جبر کیا اور نہ اصرار کیا
سب نے آقا پہ فدا ہونے کا اقرار کیا

مرحبا کہہ کے اُٹھا جلد وہ شیدائے امام
حُر نے کی آہ کہ پیاسے ہیں شہنشاہِ انام
دوڑ کر پانی وضو کے لیے لے آیا غلام
دل پہ بھر آیا کہ آنکھوں کے چھلکنے لگے جام
حُر رو رو کے وضو کر لیا ناچاری سے
پڑھ لیں دو رکعتیں خوفِ غضبِ باری سے

سوچ کر کہنے لگا خیر ہے سمجھا مطلب
نوکری جاتی رہے گی مجھے اس کا ہے تعجب
دیر سے فکر میں تھا ذہن میں اُبھرا اب
بولا حُر اب کسی مردود کا نوکر ہوں میں کب
دونوں ملعون ہیں مردود بھی ہیں ظالم بھی
تو بھی اک فاسق و فاجر ہے ترا حاکم بھی

میرا آقا ہے دل و جانِ رسولِ عربی
فاطمی و قرشی ہاشمی و مطلبی
فخرِ والا حسبی مالکِ عالی نسبی
سیّد و صفدرِ نامی نہ لے کوئی کہ ہے بے ادبی
سارے آئینہ ہیں اسرارِ سماوات اُن پہ
خوب آگاہ ہیں تو ختم ہے ہر بات اُن پہ

بس خبردار نہ کچھ کہیو ارے نافرجام
تجھ سے بیہودہ سُنے بیکار کیسے میں کلام

سنکے یہ ... کہنے لگا جلد زباں اپنی تھام
حکم دیدوں کہ تجھے گھیر لے یہ لشکرِ شام
ابھی اسوار کمندوں میں جکڑ لیں تجھ کو
یہ پیادے مرے لشکر کے پکڑ لیں تجھ کو

سن کے یہ حُر کے برادر نے جو بدلے تیور
پھر کے فرزند نے کی تیغ کے قبضہ پہ نظر
میاں سے بے وفا دار نے کھینچا خنجر
جا کے خیمہ میں چھپا بھاگ گیا وہ خود سر
حُر نے دیکھا کہ قیامت کا ہے غصہ سب کو
ابھی موقع نہیں ہے کہہ کے یہ روکا سب کو

یہ کہا میں بھی جو مرا ہاتھ و پنجہ کا فریقین
دی صدا حُر نے کہ اے دشمنِ اولادِ حسین
ناگہاں دیکھا کہ رانوں میں ہے گھوڑا بے چین
لے میں جاتا ہوں سوئے ابنِ شہِ بدر و حنین
جس سواروں پہ تجھے ناز ہے ٹوکیں مجھ کو
اور انہیں کہا سے پیادوں سے کہ روکیں مجھ کو

یوں اُڑا وہ کہ دلِ طائرِ سدرہ پھڑکا
اور کڑکا وہ کمانوں کا سُنا جب کڑکا
ساتھ چلنے میں جو آگا کسی کے دھڑکا
روکنا چاہا تو شعلہ کی طرح سے بھڑکا
غل ہوا فوجِ عدو میں کہ جری جاتا ہے
اٹھ کے کرسی سے کہا شاہ کہ حُر آتا ہے

گئے پھر پھر کے تعاقب میں جو آئے تو ہوا
دورِ صبح کے شکل آتے ہی چار و چار آ
ستو فرمایا ہوتی شہ میں ہوئے گھوڑے پڑا
فرسِ حُر سے قریب آ کے بدل دی رفتار
اب جو دیکھا تو حواس آ کے ہوئے جاتے ہیں
سامنے حضرتِ شبیر نظر آتے ہیں

دی صدا اُس نے کہ محبوبِ الٰہی کے حبیب
یا خدا تجھ سا ملا کھل گئے میرے نصیب
بحرِ عصیاں سے کہ تلاطم میں تباہی پہ غریب
المدد اب مری کشتی ہے کنارہ کے قریب

تو اگر چاہے تو چُک جائے بکھیڑا میرا
پار ہو جائے ترے لطف سے بیڑا میرا

خود پکارے شہِ دلگیر کہ آ بخش دیا
لے خدا نے بھی ترا جرم جو تھا بخش دیا
جو گنہ تھا سو رسولِ دوسرا بخش دیا
باغِ جنت تجھے اے ماہ لقا بخش دیا

تذکرہ ہوگا سدا اہلِ وفا میں تیرا
نام موجود ہے فردِ شہدا میں تیرا

سُن کے یہ پاؤں سے لپٹا جو حُرِ نیک سرشت
حُر نے کی عرض اسی واسطے چھوڑا ہے کنشت
پشت پہ ہاتھ دھرا کہہ کے مبارک ہو بہشت
تجھے اِن قدموں کے بل جائے زمیں دو بالشت

کفن اس دستِ کرم سے جو عنایت ہو جائے
مجھ سے عاصی کے لیے حُلّۂ جنت ہو جائے

رشید اور قصیدہ

غزل کے لیے سادگی زبان - حسن محاورات - نزاکت خیال کی ضرورت ہے۔ مثنوی کے لیے واقعہ نگاری - طرز بیان - تعلق و ترتیب درکار ہے۔ اسی طرح ہر صنف سخن ایک خاص طرز کی محتاج ہے۔ برخلاف اس کے قصیدہ کے لیے زور الفاظ - چستی بندش - بلندی خیال - سلاست ترکیب - درستی تشبیہ - غرض یہ ایسی چیزیں ہیں جن کے بغیر قصیدہ قصیدہ نہیں بنتا بلکہ اور کچھ ہو جاتا ہے۔ اگر کسی قصیدہ میں یہ گویں مذکورہ بالا اسباب و صفات کم و بیش موجود نہوں یا دو ایک ہوں تو اہل فن کے نزدیک قصیدہ گو کا اطلاق تو اس پر صحیح ہو جائیگا مگر سمجھی اس میں یہ صفتیں ناقص تصور کی جاتی گی۔

کامل قصیدہ گو شعرائے اردو میں مرزا رفیع سودا نے قصیدہ کو قصیدہ کی حیثیت سے کہا اور اُن کے قصائد میں وہ تمام اسباب موجود ہوں کہ مجموعہ ہیں جو قصیدہ کے لیے ضروری ہیں۔ اور اُن کے بعد قصیدہ گوئی پر ذوق و غالب و مومن وغیرہم کی باری آتی ہے ذوق بے شک ایک با کمال شاعر تھے۔ اردو کا پاکیزہ روزمرہ دہلی میں یا تو میر نے کہا یا پھر اُن کے بعد ذوق نے۔ مگر میں اُن کو سودا کے سامنے کامل قصیدہ گو کہنے کو تیار نہیں حالانکہ اُن کا پورا مجموعہ قصائد موجود ہے جس میں زور الفاظ و ترکیب چستی بندش بلندی خیال سب کچھ پائے جاتے ہیں لیکن پھر بھی جن حضرات کی نظر سے فارسی کے چست قصیدہ گو مثلاً خاقانی - انوری - ظہیر فاریابی - عرفی - قاآنی وغیرہم کا کلام گذرا ہو اور بشرطیکہ وہ مذاق سلیم اور فکر صحیح بھی رکھتے ہوں۔ اُن کے سامنے ذوق علیہ الرحمہ کے جزیل قصیدے شان الفاظ یا مجموعۂ الفاظ و تراکیب کے جاننے کے سوا اور کچھ وزن نہیں رکھتے۔ پڑھنے والے کا دماغ جزالتِ الفاظ کے دباؤ میں دبا جاتا ہے

اور اُس کو بلندیِ خیالات یا خوبیِ نظم کی تمہیدوں سے مایوس ہو جاتی ہے۔ اس کی غزل میں
غزل کا مزہ آتا ہے مگر ان کے قصائد میں قصائد کا لطف کافی میسر تھا +

رہے غالب وہ اُردو کے قصائد ہی میں نہیں بلکہ غزل میں بھی اکثر فارسی کے
چست گو مثلاً عرفی و ظہوری کی بلند خیالیوں کا اتباع کرتے ہیں۔ اُن کے فارسی کلام کا
کیا ذکر۔ اس لیے اُن کے مختصر اُردو کے قصائد میں پڑھنے والے کو فارسی کے قصیدہ گویوں کی
جھلک نظر آتی ہے۔ حیثیتِ خیال اُردو کا وہی قصیدہ، قصیدہ ہے جس کو پڑھ کے کم از کم
فارسی کے قصائد کا لطف آ جائے۔ ورنہ نظمِ سخن کے لیے تو بڑی گنجائش ہے +

غزل گو اُردو زبان پر احسان کرتا ہے برخلاف اس کے اُردو کا ایسا اچھا قصیدہ گو
علومِ مشرقیہ کے وقار کو قائم رکھتا ہے۔ اس کی قوت دکھاتا ہے اور الفاظ و تراکیب کی خوبی کے
علاوہ بلندیِ فکر کے جواہر پیش کرتا ہے۔ غالب نے زبانِ اُردو پر احسان نہیں کیا بلکہ
تخیلِ شعر پر احسان کیا۔ ذوق نے فقط قصیدہ سے علومِ مشرقیہ کے وقار کو قائم رکھا مگر
اپنی غزل گوئی سے زبانِ اُردو کی پرورش کی۔

صحبتِ قصیدہ خوانی اور رشید

جناب رشید نے عموماً قصائد نہیں کہے اور نہ اُن کو ضرورت
تھی۔ اگر کسی رئیس کی تعریف مقصود ہوتی تھی تو اُس کے لیے رباعی
کے چار مصرعے کافی تھے۔ وہ مداحِ امام تھے۔ مداحِ عوام نہ تھے۔ مگر سال میں ایک
قصیدہ ضرور کہتے تھے اور عریضے کے ساتھ پندرہ شعبان المعظم کو (جو ولادتِ آخر الزماں
کی صبح ہے) دریا میں ڈال دیتے تھے۔ اور اُس کے بعد اُسی وقت اپنے مکان ہی پر پڑھا
کرتے تھے۔ ایک معقول مجمع ہو جاتا تھا۔ لیکن پھر بھی بہت سے مشتاقِ کلام نہیں پہنچ سکتے
تھے کیونکہ وقت بہت نازک ہوتا تھا اس وجہ سے جناب مولانا سید محمد حسین صاحب قبلہ مدظلہ مغفور

دوسرے یا تیسرے روز اپنے مکان پر ۸ بجے صبح کو ایک محفل منعقد قرار دیتے اور رشید وہی نیا قصیدہ دوبارہ پڑھتے تھے۔ ہمیشہ یہ ہوتا تھا کہ کثرت سامعین کی وجہ سے مغفور کے وسیع مکان میں گنجائش باقی نہ رہتی تھی۔ اور لوگ دروازہ کے باہر تک کھچا کھچ بھرے ہوتے تھے۔ رشید نے سوائے خاندان رسالت کے کسی دوسرے کو اپنا ممدوح نہیں بنایا۔ اس لیے صرف مدح ائمہ میں قصائد ملے اس کے سوا کچھ نہیں +

یہ قصیدے نہایت سلیس اردو زبان میں ہیں۔ غزل کے شوخ مضامین سے کوئی شعر خالی نہیں۔ اُن کے قصائد میں بیشتر وہ شان نہیں پائی جاتی جو محققین سخن نے قصائد کی تعریف میں ناگزیر لکھی ہے۔ خلاصہ یہ کہ رشید کے قصیدے بھی زبان اردو اور محاورات انیس کے عمدہ نمونے ہیں۔ ذیل میں رشید کے چند قصیدوں کا اختصار درج ہے۔

انتخاب قصائد

در مدح امام و واندہم علیہ السلام

رہیں ہم بحر عالم میں نہیں یہ بات امکاں میں
ٹھہر سکتے نہیں ہیں آکے آنسو چشم گریاں میں

کبھی کنگھی جو کرتے آپ کی زلف پریشاں میں
پریشانی نہ ہوتی حضرت یوسف کو زنداں میں

نہیں جو آپ کا قائل وہ مذہب کچھ نہیں رکھتا
معین ہو گئے ہیں کن آخر آپ ایماں میں

خدا نے ابتدا اور انتہا کا دھیان رکھا ہے
رسول اللہ کا ہے اور تمہارا نام قرآں میں

نبی فرماتے ہیں جب پھول چکھتے ہیں اس چمن اپنا
ابھی اک پھول اور آئے گا جنت کے گلستاں میں

تصور میں قریب حضرت کے یوں اصحاب بیٹھے ہیں
تعلق جس طرح سے ہے دہن ہائے دنداں میں

اگر نار غضب تیری اجازت لے لے رحمت سے
ہمیشہ ابر تر سے آگ برسے فصل باراں میں

خوشی ہے آپ کے آنے کی ہر سارے زمانہ کو
کہ اب تو لوگ باتیں کرتے ہیں شہر خموشاں میں

بھلا یہ کون کہتا ہے کہ محتاج ہے کا عالم تھا
مگر تم سے بچھڑ کے تھے حیدر صفدر کو وہاں میں

کیا ہے تم نے مداحوں کا سالار ہاں میں بلا لو
قیامت ہے کہ میری قبر ہو گو غریباں میں

یہ رشید آقا سے کہہ وہ ناخدا ہیں بحر قائم میں
بھروسا جلدی خبر لیجے میری کشتی ہے طوفاں میں

ایضاً

آؤ گے جب تم تو بالکل فیصلہ ہو جائے گا
کفر سے دیں اک اشارہ میں جدا ہو جائے گا

آپ کا آنا جب عالم پیا ہو جائے گا
پاؤں کی آواز سے محشر بپا ہو جائے گا

کچھ ہمیں پروا نہیں ہے گر چھپا لے گا نگاہ
ماہ نو تیرا اگر پیار نہ سا ہو جائے گا

ہونگے پھولوں سے زیادہ آپ کے نقش قدم
گلشن جنت در دولت سرا ہو جائے گا

آپ کہلا بھیجیے گا صبر کرتا ہوں میں
ایک ایسا میرا نالہ رسا ہو جائے گا

گر کہوں گا آپ میری التجا سنتے نہیں
[illegible] ہو جائے گا

مصلحت ہو گی تو تم کو بھیج دے گا کبریا
آج ہو موعود کل وعدہ وفا ہو جائے گا

جب سنیں گے صور اٹھ کر قبر سے دوڑیں گے ہم
شور محشر پر شکوہ سے کی صدا ہو جائے گا

کربلا میں ہے اور بلا میں بھیجو جلدی خبر
ورنہ آخر نام دل کا کربلا ہو جائے گا

جلد تر ہو پہنچانے کو میرا عریضہ آپ تک
تیز بہتے بہتے سب دریا ہوا ہو جائے گا

سوئے شہ جانے کو ہیں سب منتظر کہتا ہوں میں
ہم کو اٹھتے ہی روانہ قافلہ ہو جائے گا

آؤ گے جب تم تو دشمن ڈر گئے میں ہونگا شاد
وہ بڑا مانیں گے اور میرا بھلا ہو جائے گا

کفر سب عالم میں پھیلے جلد کہتا ہوں رشید
جانتا ہوں اس سے میرا مدعا ہو جائے گا

رباعیات و سلام

رباعی جس قدر مضامین و فصاحت آمیز کلام سے مالا مال ہو اُسی قدر اُس کی عمدگی ہے۔ خصوصاً چوتھے مصرعہ کا اس طرح صاف اور بے تکلف ہونا چاہیے کہ پڑھنے والے کے دل پر وہ مضمون اثر کر جائے جس کے لیے چار مصرعے کہے گئے ہوں کیونکہ باقی تین مصرعے فقط چوتھے کے خیال کو پورا کرنے میں ممد ہوتے ہیں۔

شعرائے اُردو اور رباعی

جہاں تک دیکھا جاتا ہے اُردو شاعروں میں رباعی کے حق میں کوئی اتنا کامیاب نظر نہیں آتا جتنا مرثیہ گو حضرات۔ ظاہر وجہ یہ ہے کہ علاوہ مرثیہ گویوں کے دوسرے شاعروں نے رباعیات صرف تفنن طبع کی غرض سے کہیں کہ انھیں اس صنفِ سخن میں زیادہ معذور نہ سمجھے ورنہ رباعی کا مصرف اُن کے لیے مفقود ہے۔ ہر مشہور شاعر غزل گو نے رباعیاں کہیں مگر بہت کم۔

لیکن خلیق۔ انیس۔ مونس۔ دبیر۔ عشق۔ تعشق۔ نفیس۔ رشید۔ عارف۔ اوج۔ یا اور دوسرے مرثیہ گویوں کے کلام میں رباعیات کا بھی کافی ذخیرہ ملتا ہے۔ یہ کیوں۔ یہ اس وجہ سے کہ مرثیہ گو جب نیا مرثیہ پڑھنے منبر پر بیٹھتا ہے تو اُس کو ضرورت ہوتی ہے کہ سامعین کو مضامین مرثیہ سننے کے لیے پہلے آمادہ کرلے۔ اور اُسی کے بعد مرثیہ شروع کرے کیونکہ اگر فوراً ہی بغیر رباعیات و سلام مرثیہ شروع کر دیا جائے تو سامعین کو متوجہ ہوتے ہوتے بہت سے اُن مصرعوں کا خون ہو جائے جو شاعر نے خون جگر صرف کر کے کہے ہیں میری غرض یہ ہے کہ رباعیات و سلام مرثیہ کے لیے وہی کام دیتے ہیں جیسے ایک عمدہ نثر کا تمہیدی حصہ جو پڑھنے والے کو آنے والے مضامین کی اجمالاً خبر دیتا ہے اور اُس کے اشتیاق کو بڑھا دیتا ہے
رشید نے بہت رباعیاں کہیں۔ مگر اُن سب میں مضامین پیری کے متعلق جتنی پائی اُتنی کسی دوسرے مضامین کی نہیں پائی جاتیں۔ ذیل میں رباعیات و سلام کا انتخاب درج ہے۔

انتخاب رباعیات متعلق پیری

پیری و بیچارگی	دل کو سو سو طرح کے غم کھلنے دو جانے کا جوانی کے ہے غصہ بیکار		پیری جو رشید آئی ہے آنے دو دیکھو اپنی طرف بس اب جانے دو	
آرام لحد اور عمر [illegible]	پیری سے ہیں خم راہ جہاں کیونکر لیں لیٹے ہیں لحد میں اے فرشتو نہ ستاؤ		اک عمر پھرے ہیں ہم ذرا دم بھر لیں چلتے ہیں ذرا کمر تو سیدھی کر لیں	
جوانی کا غم	مدت سے جوانی کا الم باقی ہے یوں جھک کے جوانی سے ملا وقت وداع		اک عمر سے یہ نشان غم باقی ہے جب سے اب تک کمر میں خم باقی ہے	
فلک شکایت	پیری میں خمیدہ کر دیا ہے تو نے سیدھا ہونے دے اب تو اے پیر فلک		ظالم کیسا ستم کیا ہے تو نے ایسا مجھے بنا لیا ہے تو نے	
پیری اور ضعف	پیری نے جوانی کی جو دولت لے لی لاحَولَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللہ		گویا مرے قتل کی اجازت لے لی ظالم نے توانائی و طاقت لے لی	
اُمید جنت	نامی ہوئے بے نشان ہونے کے لیے کی موت قبول خواہش جنت میں		افسانہ ہوئے بیان ہونے کے لیے ہم پیر ہوئے جوان ہونے کے لیے	
خمیدگی کمر اور حسن تعلیل	آخر ہوں میں فراق پاتا ہوں میں پیری سے نہیں ہے خم سفر ہے نزدیک		ہستی سے عدم کی سمت جاتا ہوں میں دل بیٹھ گیا جھک کے اٹھاتا ہوں میں	
پیری اور یاد مرگ	بیتاب ہے یہ قلب حزیں اپنی طرف پیری میں جھکے جانے کا باعث یہ ہے		اور روح کو آرام نہیں اپنی طرف اب کھینچتی ہے ہمکو زمیں اپنی طرف	

یادِ جوانی	پیری سے خاک مہربانی نہ ہوئی یوں توڑتا دم کہ دیکھنے لوگ آتے	وقتِ آخر بھی کامرانی نہ ہوئی افسوس کہ اس وقت جوانی نہ ہوئی
پیری اور [illegible] باطل	پیری میں رشید یہ بدآئینی ہے آئینہ بھی دیکھتے ہو ماشاءاللہ	بالوں میں خضاب طرفہ رنگینی ہے اب تک تم کو خیالِ خودبینی ہے
[illegible]	کیا بات ہے کس خوف سے تھراتا ہوں پیری تو جوانی سے گراں قدر نہیں	کچھ قوت و طاقت میں کمی پاتا ہوں کیا بوجھ پڑا ہے کہ جھکا جاتا ہوں
جوانی سے [illegible]	پیری کیا موت کی نشانی پہنچی رستے میں بھی ملنے کی توقع نہ رہی	مر دیکھا اب مرگِ ناگہانی پہنچی ہم اب چلے جب دورِ جوانی پہنچی
پیری اور [illegible]	طفلی تو گئی دور ابھی کیا جانیں ہم پیری نے یہ حال کر دیا آنکھوں کا	پائیں نہ کہیں خاک بھی گر چھانیں ہم ملجائے جوانی تو نہ پہچانیں ہم
[illegible] کی شاعرانہ معذرت	ہیں یاد وہ دن نظر میں جو ذہن میں ہیں تربت میں گنہ اپنے بیاں کر کے رشید	سمجھونگا۔ مرے پاس بھی کچھ گھاتیں ہیں کہدونگا جوانی کی یہ سب باتیں ہیں
پیری اور [illegible] تکلیف	پیری میں عبادتوں کی کہاں طاقت ہے پیری میں یہ خدا نے کی ہے تخفیف رشید	سچ پوچھتے ہو گر تو فقط ہمت ہے دیکھو کہ نمازِ صبح دو رکعت ہے
خمیدگی کمر [illegible] افسوس	ملتے ہیں دلِ غم یہ کل چنتا ہوں ہر بار خمیدہ ہوتی جاتی ہے کمر	رعشہ پیری سے کب ہے سر دھنتا ہوں جھک جھک کے صدائے آہِ دل سنتا ہوں
علامتِ پیری	جھریاں وہ بلائیں جان پر آتی ہیں پیری کا بڑھا ہے زور کیا دیکھوں میں	یہ برچھیاں پتھر میں بھی در آتی ہیں آئینہ میں جھریاں نظر آتی ہیں

پیری اور احباب سے جدائی	پیری وہ ہے کہ جس کا مارا ہوں میں چھپ جاؤں نظر سے ہر دو ہنگام قمر	اے بھائیو مہمان تمہارا ہوں میں وقت اور ہے اب صبح کا تارا ہوں میں
پیری اور [illegible]	دیکھی سبب سن کی مہربانی ہم نے رکھا نہ وہ دل جس میں تھیں لاکھوں باتیں	سن لی اک اک کی لن ترانی ہم نے طے کر دیا قصۂ جوانی ہم نے
انقلاب	ایسا کبھی نہ انقلاب دیکھا ہوگا کہتا ہوں جو میں کہ تھی جوانی میری	کب میری طرح شباب دیکھا ہوگا پیری کہتی ہے خواب دیکھا ہوگا
یاد جوانی	کیوں جاگ کے سوئے عالمِ فانی آئی کہتا ہے ہمیں ذرا دکھائے تیور	مغرور اگر تھی نہ جوانی آئی اے کاش صدا سے لن ترانی آتی

سلاموں کا انتخاب

ہیں بر میں صبر کوششِ خوشخو لیے ہوئے	جاتا ہے دل کو تیر سے پہلو لیے ہوئے
کہتے ہیں شاہ لیتے ہیں اکبر جو کروٹیں	امت کی بھی نجات کا پہلو لیے ہوئے
جنسِ ثواب بکتی ہے میدانِ حشر میں	ہم بھی کھڑے ہیں قطرۂ آنسو لیے ہوئے
میرے گناہ تولتی ہے رحمتِ خدا	قدسی الگ کھڑے ہیں ترازو لیے ہوئے
اس فوج سے نہ کیوں دلِ شبیر ہو قوی	جس کا نشان ہو قوتِ بازو لیے ہوئے
خیمہ سے لاش لے چلے اکبر کی شہ حسین	ماں دوڑ کر آئی ہاتھوں پہ گیسو لیے ہوئے
طوقِ آہن عابدِ دلگیر کا دمساز ہے	خیر مقدم نالۂ زنجیر میں آواز ہے
ایک معصومہ کی عصمت جلوہ فرما ہے جہاں	حضرت مریم کی عصمت فرقِ پا انداز ہے
منہ لیے اٹھتے زخم کھائے اس ہیں کتنے [illegible]	دل کے سوز [illegible] ہیں کہاں ناز ہے

زخم کھانے ہی علی اصغر کر سکے انتقال
تیر مرغ روح کو گویا پر پرواز ہے
مرے جاتے ہیں علی اکبر جوانی ہے شروع
عمر کا انجام ہے اور سبزہ کا آغاز ہے
جو کہوں گا تو کرے گا دمبدم کہتے تھے شاہ
اے مرے مالک مجھے رحمت پہ تیری ناز ہے
یا و اصغر بھی ہے شہ کو زخم کھانے کا بھی شوق
دل لئے جاتی ہے ایسی تیر کی آواز ہے

روکتا کون اہل کیں کو ایک بھی یاور نہ تھا
لوٹنے جب آئے تھے ظالم کوئی در پر نہ تھا
چین کیا پاتے حرم زنداں کچھ اپنا گھر نہ تھا
اونچی نیچی تھی زمیں تکیہ نہ تھا بستر نہ تھا
کس سے پوچھوں دشت میں کیا گیا کیوں زیر تیغ
زانو سے زہرا کے جو رہتا تھا یہ وہ سر تھا
کربلا تک لے گئی تھیں پھر کے جب پہنچیں وطن
ماں کے ساتھ اکبر نہ تھے اور گود میں اصغر نہ تھا
بعد قتل شاہ دیں ہر ایک کا تھا دل لہو
بس کے نیچے خوں نہوایا کوئی پتھر نہ تھا
جنگلوں میں روز و شب پھر پھر کے کہتے تھے حرم
یوں ہوئے بے گھر کبھی جیسے ہمارا گھر نہ تھا
کٹ گیا سر شہ کا ڈوبی کشتی آل رسول
ناخدا بیچارہ تھا بیمار اور لنگر نہ تھا
پوچھ سکے رضوان ایسا تاجباں ہے ایسے رشید
واہ وا کیا ہیں غلام حضرت قنبر نہ تھا

خوشی سے زخم کھائے یوں شہ دلگیر آتے ہیں
ادھر دم جاتا ہے دل جب سامنے سے تیر آتے ہیں
نکل آتی ہیں حوریں کوثر و تسنیم سے باہر
خبر پہنچی ہے ماں سے حضرت شبیر آتے ہیں
[illegible] کے بعد [illegible] کر کہیں کما نہ شہ نے فرمایا
علی اصغر گئے وسا سے اب کیوں تیر آتے ہیں
سکینہ ہیں شاہ دیں سے کہ گھر [illegible] ہیں [illegible]
یہاں ہر دم کیا اصغر بے شیر آتے ہیں
نہ نکلے اس سے [illegible] یہ ہے منظور عابد کو
فقط آنسو بہانے تھاشے [illegible] تیر آتے ہیں

آرہے ہیں رن میں اکبر دوڑے ہیں [illegible]
سامنے کو رسول اللہ کی تصویر آتے ہیں

کس طرح دل جانِ زہرا سے سنبھالا جائیگا / تیر کیونکر حلقِ اصغر سے نکالا جائے گا
یہ سمجھ کر لے گئے ہمراہ اصغر کو حسینؑ / قید میں بانو سے یہ بچہ نہ پالا جائے گا
روکیا اکبر کو تم زینب سے کہتے تھے حسینؑ / اذن اگر مانگا بہن مجھ سے نہ ٹالا جائے گا
سب وصیت کر کے شہ سے یہ کہا سجادؑ نے / مجھ سے یہ بچوں کا گھر کیونکر سنبھالا جائے گا
کہتے تھے سب بن گیا عابد کا جب طوقِ گراں / ہائے یہ گردن میں کس بیکس کی ڈالا جائے گا
رو کے فرماتی تھیں زہرا کو دیں گے جب حسینؑ / میرے بچہ بے خطا تو مار ڈالا جائے گا
کہتے تھے عابد مٹے تلووں کے سارے آبلے / پر قیامت تک نہ دل کا کوئی چھالا جائے گا
شور ہے جلو میں سر لیتے ہیں اصغر کا لہو / حشر آ جائے گا جب یہ خوں اچھالا جائے گا
مرثیے جائیں گے ہم قبر میں بھی اے رشید / یہ ہمارے ساتھ جنت کا قبالا جائے گا

شیخ مسیح الدولہ

غدر کے بعد سے لکھنؤ وہ لکھنؤ نہیں رہا جس کی ہوائیں اہلِ کمال کا طواف کرتی تھیں اور ان کو اپنے آغوش سے جدا ہونے کی اجازت نہ دیتی تھیں۔ لکھنؤ کے وہ اہلِ دولت جن کے قدرشناس ہاتھوں نے کمال کی مختلف تصویروں پر زر ریز کیا اور بہاریں دیکھیں۔ آج اپنے سینوں پر خالی ہاتھ رکھے لکھنؤ کے ویران و بے نشان قبرستانوں میں آرام کر رہے ہیں اور اپنی بیکسی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے گزرنے والوں کو کُلُّ مَنْ عَلَیْہَا فَانٍ کا زبردست حکم یاد دلاتے ہیں + لکھنؤ کا گیا گزرا زمانہ تھا اور کمال کا وداعی وقت تھا۔ کہ پھر بھی آتش، و ناسخ کو [illegible] الدولہ بہادر نے ایک معقول یکمشت رقم دے کر کہا کہ میرا اب وہ زمانہ نہیں ہے جو آپ لوگوں کی خدمت میں ماہانہ پیشکش کیا کروں۔ لہذا یہ رقم یکمشت قبول فرمائیے۔ ناسخ مغفور چونکہ ایک تاجر کے فرزند تھے۔ انھوں نے روپیہ کی قدر کی۔ اور بہن کی سسرال میں دوکانیں اور مکانات خریدے

اپنی آخذ زندگی کمال کی بدولت آرام و آسائش سے گزاری، بیچارے آتش مرحوم وہمیشہ کے مست خیال تھے کبھی دولت کی پروا کی ہوتی تو یہ روپیہ بھی رہتا۔ ایک ہی سال میں کما کما کے بیٹھ رہے۔ اور پھر وہی مفلس آتش ہو گئے۔ خواجہ سعدی کے قول کو قوی کیا ایک شاعر نے کہا دوسرے نے عملاً دنیا کو دکھا دیا کہ ؎

نیم نانے گر خورد مرد خدا — بذل درویشاں کند نیمے دگر

ترک وطن اہل کمال — وہ زمانہ آ لگا تھا کہ انیس اریسا مستغنی المزاج بھی ایک دفعہ لکھنؤ چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔ اگرچہ ضیافت کرنے والوں نے قدر شناسی اور عزت کمال میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔ مگر پھر بھی لکھنؤ کی گری ہوئی ہوا انیس کو جلد سے جلد حیدرآباد سے اپنے مرکز پر کھینچ لائی +

یہ ضرور ہے کہ اہل کمال کو ہوس زر سے مستغنی ہو جانا چاہیے مگر ضرورت زمانہ کسب معاش پرورش عیال ترک وطن پر مجبور ہی کر دیتے ہیں۔ لکھنؤ کی خاک اب بھی اہل کمال کے پیدا کرنے میں قاصر نہیں۔ مگر اس دور ناگوار سے مجبور ہو کر ان کی وقتی جدائی گوارا کر لیتی ہے +

رشید کا نوکر کمال جب لکھنؤ کی کسوٹی پر ایک نمایاں رنگ دینے لگا تو ہندوستان کے شیعی حلقوں میں ان کے کلام کے سننے کا اشتیاق پیدا ہو گیا۔ اور خود رشید کے ضروریات زندگی بھی کثرت تعلقات سے وسیع ہو گئے گئے۔ پہلے جو حضرات لکھنؤ کے باہر رشید کے کلام کے مشتاق ہوئے وہ دو بزرگ نواب صفدر حسین خاں صاحب اور نواب ترصد حسین خاں صاحب شیخ پور حسین آباد کے تھے۔ ان حضرات کے یہاں رشید مدت تک جاتے رہے +

رشید رامپور میں

اس وقت کہ نواب مشتاق علی خاں بہادر مرحوم کا انتقال ہو چکا ہے اور جنرل اعظم الدین خاں کا دور دورہ ہے۔ موجودہ نواب عالی وقار نابالغ ہیں گورنمنٹ آف انڈیا کی طرف سے جنرل مذکور انتظام ریاست کے لیے مقرر ہوئے ہیں +

نواب صفدر علی خاں صاحب مرحوم خلف نواب محمد سعید خاں بہادر نواب کلب علی خاں بہادر (خلد آشیاں) کے چچا تھے۔ مذہب اثنا عشری رکھتے تھے۔ اور مجالس محرم اور تعزیہ داری کی رسم رامپور میں ادا کرتے تھے +

جب ۱۸۸۷ء میں نواب مشتاق علی خاں صاحب بہادر تخت نشین ہوئے تو اُنھوں نے اپنے اجداد کے بناکردہ امام باڑہ کو پھر ذکر حسین سے آباد کیا جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ اُن مرحوم کے بعد بھی جناب مدار عالیہ مغفورہ کے اثر سے ریاست کے امام باڑہ میں محرم کی مجالس برابر ہوتی رہیں۔ چنانچہ تقریباً ۱۳۱۴ھ میں نواب صفدر علی خاں صاحب مرحوم کی تحریک سے جنرل مذکور نے جناب رشید کو مجالس محرم پڑھنے کے لیے طلب کیا۔ ریاست کی طرف سے جناب رشید کی بہت خاطر مدارات ہوئی۔ دونو وقت خاصہ کا کھانا اور اشیاء ضروری بھی بافراط مہیا رہتے تھے +

نواب رامپور اور رشید

اُس وقت عالی جناب نواب حامد علی خاں بہادر بالقابہ بغرض تبدیل آب و ہوا نینی تال پر رونق افروز تھے۔ صرف جناب رشید کو سننے رامپور تشریف لائے جس کا اظہار بوقت ملاقات فرمایا۔ یعنی نواب صاحب نے جناب رشید سے فرمایا کہ میں آپ کو سننے کے لیے پہاڑ سے آیا ہوں۔ جناب رشید نے جواب میں عرض کیا "قدردانی"

اُس وقت یہ وسیع قلعہ نہ تھا بلکہ طرز قدیم کے موافق ایک چہار دیواری تھی اور بڑے دروازہ پر ایک توپ لگی رہتی تھی۔ اس دروازہ کے قریب پرانا امام باڑہ تھا جس کا نشان

اب نہیں پایا جاتا۔ صرف چند گذشتہ والیان ریاست کی قبریں جالی دار چوکھٹے میں ڈھکی نظر آتی ہیں۔ نواب حامد علی خاں صاحب بہادر نے مچھی بھون کے جانب جنوب ایک خوشنما امام باڑہ معہ ایک مختصر مسجد کے تعمیر کرایا ہے۔ اس میں معہ شاہ نشین تین درجے ہیں۔ سب سے آخر یعنی شاہ نشین پر چاندی کی ایک بڑی اور خوشنما ضریح رکھی ہے اور اس پر سبز مخمل کا کار چوبی شامیانہ نصب ہے۔ ماہِ محرم میں اس ضریح کے دونو طرف دوسری ضریحیں اور علم رکھے جاتے ہیں۔ بیچ کے درجہ میں ایک بڑا چاندی کا ممبر ہے اسی درجہ میں شاہ نشین سے متصل نواب صاحب سیاہ مسند پر ماہِ محرم میں تشریف فرما ہو کر شریک مجالس ہوتے ہیں۔

امام باڑہ کے آگے ایک چبوترہ ہے جس کا مغربی جانب مسجد کے صحن سے ملتا ہے۔

المختصر جناب رشید نے مجالس پڑھنا شروع کیں پہلی مجلس میں یہ مرثیہ پڑھا۔

دفنِ علی اصغر سے جو فرصت ہوئی شہ کو

چونکہ ساٹھ ستر آدمیوں کا مجمع ہوتا تھا جس میں بیشتر اراکینِ ریاست ہوتے تھے۔

نواب صاحب کی سخن سنجی

جناب رشید نواب صاحب کی نکتہ رس طبیعت کی تعریف فرماتے تھے اور تعجباً کہتے تھے کہ سرکار ایسی جگہ پیدا ہوئے تھے کہ مجھ کو حیرت ہوتی تھی۔

ایک روز جناب رشید مرثیہ پڑھ رہے تھے۔ اثنائے خوانندگی میں نواب صاحب نے فرمایا "آپ کو بیٹھے تکلیف کرنی ہوگی" جناب رشید نے عرض کی "حضور دیکھا جائے گا" نواب صاحب نے پھر فرمایا "نہیں نہیں وعدہ کیجیے" ایک جناب رشید کے الفاظ تھے "حضور کا ایسا حکم ہوگا" سہ بارہ نواب صاحب نے فرمایا "آپ وعدہ کیجیے" جناب رشید نے عرض کی "بہت خوب"

عطائے خلعت

چنانچہ حسب وعدہ جناب رشید ہر سال تشریف لیجایا کیے۔ نواب صاحب کے با اختیار ہونے پر بھی دو سال تشریف لے گئے ہیں۔ پہلے سال جب برائے حصول زیارت جناب رشید بھی کمونلا میں تشریف لے گئے تو نواب صاحب شہر میں حاضر کر رہے تھے اطلاع ہوئی بلا لیا باتیں کرتے رہے۔ اور جب کام سے فارغ ہوئے دربار میں تشریف لائے اور حکم دیا۔ کہ ایک خلعت مع شالی رومال جناب رشید کو عطا ہو + عطائے خلعت جناب رشید کے لیے مخصوص تھی ورنہ رامپور میں خلعت دینے کا رواج نہ تھا۔ نہ ہی جناب رشید کو ہر سال تین سو پچیس روپیہ علاوہ مصارف ملتے تھے۔ ایک سال نواب صاحب کو رشید کا کلام بہت پسند آیا وقت ملاقات جوش مسرت میں فرمایا "جب میں با اختیار ہونگا تو بہت کچھ دونگا" ایک سال ریاست سے طلب کا تار نہ آیا لہذا پھر نہ گئے +

رشید عظیم آباد میں

عظیم آباد میں شیعوں کی بیشتر تعداد انیس کے ماننے والوں کی ہے۔ اور خود میر انیس مرحوم نے وہاں بڑے بڑے معرکہ کی مجلس پڑھی ہیں۔ دبیر کے شیدائی بھی ہیں مگر تعداد کم + یہ ابتدا ہی سے مشہور تھا کہ رشید اپنے نانا انیس کی زبان کہتے ہیں۔ لہذا وہاں کے لوگوں میں جیسا اشتیاق پیدا ہو سکتا ہے ظاہر ہے + اس بنا پر دو سال سے شہر سے لوگوں نے خواہشیں کرنی شروع کیں کہ جناب رشید بلائے جائیں۔ چنانچہ جناب چھوٹے نواب صاحب برادر خورد جناب بادشاہ نواب صاحب نے اپنے ملازمین مع خط طلب روانہ کیے۔ مگر جناب رشید نے انکار کیا۔ بالآخر شاید ۱۳۲۸ھ میں رشید کے ایک دوست جناب امین صاحب رشید کو لے گئے اور اپنے یہاں ایک مجلس پڑھوائی بعد ختم مجلس نواب صاحب مذکور نے بذریعہ رفقا رشید سے وعدہ مجلس لینا چاہا انھوں نے فرمایا: "انشاء اللہ" نواب صاحب کو اس جملہ شرطیہ انشائیہ سے اطمینان نہ ہوا

اور وقت پر خود جناب بنن صاحب کو منتخب کیا کہ لکھنؤ جا کے جناب رشید کو لائیں چنانچہ اس سال بنن صاحب لکھنؤ آئے اور جناب رشید کو باصرار لے گئے۔ باؤلی کے امام باڑہ میں مجالس ہوئیں۔ یہ وہی امام باڑہ ہے جس میں انیس کے آیات کمال کا اظہار ہو چکا ہے۔ میر نواب صاحب مونس۔ و میر ہادی صاحب وحید جس میں برسوں پڑھتے ہیں۔ رشید کے لیے اُس ممبر پر بیٹھنا باعثِ فخر تھا۔ جو اُن کے جدِ کامل انیس کا قدم آشنا تھا۔

جب رشید پہنچے مجلس منعقد ہوئی۔ سارا عظیم آباد جمع ہو گیا۔ خود فرماتے تھے کہ تقریباً ڈیڑھ ہزار آدمیوں کا مجمع ہوتا تھا۔ جن میں اہلِ ہنود پانسو سے کم تعداد میں نہ ہوتے تھے۔ رشید وہاں ایک عشرہ پڑھتے تھے۔ دو بجے مجلس شروع ہوتی تھی اور چار بجے ختم ہوتی تھی۔ سامعین اس قدر محظوظ ہوتے تھے کہ مرثیہ کہیں سے چھوڑنے نہیں دیتے تھے۔ بعد مجالس نواب صاحب ساڑھے سات سو روپیہ دیتے تھے۔ اور بہت اعزاز و اکرام فرماتے تھے۔ رشید نے انتقال کے دو سال قبل عظیم آباد جانا خود ترک کر دیا تھا۔ وجہ عذرِ پیری۔

رشید حیدرآباد میں

عالی جناب نواب بہرام الدولہ بہادر کے یہاں حیدرآباد میں بڑی بڑی نامی مجلسیں ہوتی تھیں اور ہوتی ہیں۔ ہزاروں آدمی جمع ہوتے ہیں۔ لکھنؤ کے نامی ذاکر بیشتر یہیں آئے اور آتے ہیں۔ نفیس مرحوم کے بعد جناب عارف مرحوم نے اپنے کامل نانا کی جگہ لی۔ اور ہر سال جانے لگے۔ وہاں کے نکتہ رس حضرات نے جناب نواب مذکور سے جناب رشید کے سننے کا شوق ظاہر کیا۔ لہٰذا تحریک طلب کی گئی۔ مگر تحریری جس کا کوئی نتیجہ نہ ہوا۔ دو سال برابر جناب رشید کے نام تار آیا۔ مگر انھوں نے باوجود تنگیٔ معاش

وہاں جانے سے انکار کیا۔ اسی سلسلہ میں ایک بار مولانا سید محمد مہدی صاحب قبلہ مغفور
نے مؤلف سے ایک روز فرمایا۔ کہ جناب رشید بیدار سے اور ہم سے جو دوستانہ تعلقات ہیں
اُن کو کوئی دوسرا سمجھ ہی نہیں سکتا۔ ہر امر میں مجھ سے مشورہ کرتے ہیں۔ دنیا ادھر کی ادھر
ہوجائے مگر میرا کہا نہیں ٹالتے مگر ایک موقع پر مجھ کو بڑا تعجب ہوا جبکہ جناب رشید
کے پاس دوسرا طلبی کا تار آیا تھا۔ وہ تار لیے ہوئے فوراً میرے پاس آئے اور مجھ سے
استشارہ کیا۔ میں نے اُن کے اخراجات کی زیادتی اور ذرائع آمدنی کی کمی پر نظر کرتے
ہوئے مشورہ دیا کہ فوراً چلے جائیے۔ جناب رشید سے اور مجھ سے اس پر ایک طویل
گفتگو ہوئی۔ وہ کہتے تھے اگر میں وہاں گیا تو ممکن ہے کہ کچھ خاندانی رنجشوں کا باعث ہو۔
میں کہتا تھا کہ آپ کو صاحبزادگان خود باصرار بلا رہے ہیں کسی کو شکایت کی گنجائش ہی
نہیں۔ خلاصہ یہ کہ نہ جانا تھا نہ گئے۔

دوسروں کے جذبات کا خیال

جناب رشید چونکہ مرنجاں و مرنج مزاج کے بزرگ تھے اُن کو خیال آیا
کہ اگر میں نواب بہرام الدولہ کے یہاں جانے لگا تو بہت ممکن ہے کہ وہ دوسرے ذاکرین
میں سے کسی کی کمی کریں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ جناب علی محمد صاحب عارف ہی ہوں۔ بے شک
یہی مصلحت تھی اور کچھ نہ تھا۔ ورنہ رشید کے لیے وہ وقت آزمائش تھا۔ وہ زمانہ
قرضدار ہوتے چلے جاتے تھے۔ وہ اخراجات اوّل تو بہت کم رکھتے تھے۔ اور اگر رکھتے
بھی تھے تو ہمیشہ یہ خیال رہتا تھا۔ کہ کوئی بات ایسی نہ ہو جائے جس سے باہم دلوں میں
کسی قسم کا رنج پیدا ہو جائے حتّٰی کہ اپنی زندگی کی آخری ساعت تک انہوں نے اس امر کو ملحوظ رکھا۔

سیر حیدرآباد اور جناب رشید

بہرحال جب نواب مذکور کی متواتر تین سال کی طلب پر بھی رشید نہ گئے
تو اُن کے معتمد میر بادشاہ علی صاحب ضیا مرحوم نے عرض کی۔ حضور وہ اس طرح

بلانے سے کبھی نہ آئیں گے۔ جہاں تک ممکن ہوا اُن کے بلانے کی کوشش کرونگا۔ چنانچہ
میر صاحب موصوف نے اور حکیم میر باقر حسین صاحب مغفور سے جو لکھنؤ کے ممتاز اطبا
میں سے تھے۔ باہم دوستانہ مراسم تھے۔ لہٰذا اُنھوں نے حکیم صاحب کے پاس خط
بھیجا اور اُن سے سفارش چاہی کہ وہ جناب رشید کے پاس بذات خود جائیں اور
اُن کو سفر حیدرآباد کے لیے مجبور کریں۔ حکیم صاحب چونکہ جناب رشید کے ساتھ کے
پڑھے ہوئے تھے اور بے تکلف دوست تھے۔ اس لیے پادشاہ علی صاحب کی تحریر کے
مطابق فوراً گولہ گنج تشریف لائے اور جناب رشید سے کہا۔ دیکھو بھائی میں
تمہارے پاس آیا ہوں اب تم کو حیدرآباد ضرور جانا ہوگا۔ اگر انکار کروگے تو میرے
رنج کا باعث ہوگا۔ جناب مولوی محمد حسین صاحب قبلہ بھی تشریف رکھتے تھے۔ اُن کی حضرت
تائید نے جناب رشید کے لیے انکار کی گنجائش نہ رکھی۔ صرف استخارہ پر بات ٹھیری
اور جناب مولانا کی مقدس تسبیح کے ذریعہ سے مشیت خدا نے بھی موافقت کی۔ دوسرے
روز حکیم صاحب نے میر پادشاہ علی صاحب کو کہہ دیا کہ رشید تشریف لائیں گے
طلب کا تار اور مصارف سفر بھیج دیجیے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ تار اور دو سو روپیہ آگئے
جناب رشید لکھنؤ سے حیدرآباد پہنچے۔ اسٹیشن پر نواب بہرام الدولہ بہادر کے
فرزند ارجمند نواب زین العابدین صاحب بہادر۔ اور میر پادشاہ علی صاحب مع چند
دوسرے رفقا کے موجود تھے۔ جناب رشید ریل سے اترے۔ نواب صاحب کے
صاحبزادے نے استقبال کیا۔ اور اسٹیشن سے باہر فٹن تک ساتھ تشریف لاکے سوار کرا دیا
جناب رشید فٹن میں سوار ہو کر بارہ دری سالار جنگ بہادر واقع لکڑکوٹ
باغ میں پہنچے جہاں اُن کے لیے سامان آسائش فراہم کر دیا گیا تھا۔ اسی بارہ دری میں

جناب نفیس مغفور بھی فروکش ہوتے تھے۔

جناب رشید فرماتے تھے کہ کھانا بہت نفیس آتا تھا۔ جس میں یہ چیزیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اور جن کی لطافت طعم کا اکثر ذکر کرتے تھے۔

حگر = املی کی نئی کونپل اور قیمہ۔

کھلی = وہی چاول (حیدرآباد میں بالائے فاقہ شکنی محرم میں استعمال ہوتا ہے)

نون پوری = نہایت لذیذ مزہ میں مثل جوزی حلوا سوہن کے۔

دھی کھلوا راملوا =

ناقلہ کی لوز = میوے کی مٹھائی =

پہلی مرتبہ جناب رشید محرم میں تشریف لے گئے تھے۔ اور دوسرے سال سے چہلم کے زمانہ میں جایا کرتے تھے۔ اُن کے کمال نے پہلے ہی سال سے [illegible] بعد اگر کسی کو حیدرآباد میں مقبولیت عام ہو سکتی ہے تو رشید ہی کو۔

نواب صاحب کی قدرشناسی

عالی جناب نواب بہادر الدولہ بہادر نے بھی قدر کمال کما حقہٗ کی اور اب دوسرے سال جو جناب رشید تشریف لے گئے تو بجائے لالہ کے باغ کے نواب صاحب کی خاص کوٹھی واقع نظام باغ میں قیام کا بندوبست کیا گیا۔ رشید ہمیشہ نواب صاحب موصوف کی مدح سرائی میں رطب اللسان رہتے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ میری عزت افزائی اور قدرِ سخن جیسی فرمائی گئی ہے میں اُس کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ واقعی ممدوح نے اپنے احسانات کو رشید کی زندگی ہی تک محدود نہ رکھا بلکہ اُن کے بعد بھی اُن کے پسماندگان کے کفیل رہے۔ اللہ [illegible]

شرکائے مجالس جناب رشید

بقول رشید پہلی مجلس میں تقریباً سات ہزار آدمیوں کا اژدحام دیکھا گیا تھا۔

اور اس کے بعد ہر مجلس میں پانچ ہزار سے کسی طرح کم نہ ہوتے تھے۔ یہ مجمع اگرچہ بادی النظر میں
مبالغہ کی حد تک پہنچتا ہے۔ مگر حیدرآباد سے شہر اور رشید سے ذاکر کے لیے چنداں
زیادہ نہیں۔ دوسرے یہ کہ رشید کا رنگِ سخن اپنے نانا انیس کے اتباع میں صاف
اور عام فہم ہو جائے تعجب نہیں اگر رشید کے کلام کو مقبولیت عام حاصل ہوئی۔
سر سالار جنگ بہادر مرحوم کا بنا کردہ ایک نہایت وسیع مکان ہے جو شادی خانہ کے
نام سے موسوم ہے۔ اس میں مجالس ہوا کرتی تھیں کیونکہ دوسری جگہ اتنا وسیع مجمع نہ آ سکتا تھا
علاوہ دیگر معززین شہر اور اکثر اراکین سلطنت کے حضرات بھی شرکت قابل فخر و باعث وقار مجلس تھی
عماد السلطنت نواب باقر علی خاں بہادر، منیر الملک نواب سخاوت علی خاں بہادر،
نواب خانخاناں بہادر، نواب فخر الملک بہادر، مہاراجہ کشن پرشاد شاد وزیر اعظم،
نواب عماد جنگ بہادر، نواب محبوب یار جنگ بہادر، جناب مولوی افضل حسین صاحب چیف جسٹس۔
مجلس بحضور نظام | جناب مرزا محمد صاحب اوج جناب ماہر اعلی اللہ مقامہٗ
جناب ... خاں صاحب بہادر کے یہاں مجلس پڑھتے تھے۔ غالباً ۱۳۲۳ھ میں
حضور نظام ... مجلس میں تشریف لائے اور جناب اوج مغفور کو سنا۔ بعد ختم مجلس
زبان مبارک سے ... کوئی اور مرثیہ خواں ہیں؟ ... مسند شاہی نے دست بستہ عرض کی
ظل اللہ انیس مرحوم کے نواسے جناب پیارے صاحب رشید بہادر الدولہ کے یہاں
مجلس پڑھتے ہیں۔ نواب بہرام الدولہ بہادر کو شرکت مجلس کے لیے عرض کرنے کا
اتفاق سے ایک بیش بہا موقع مل گیا۔ انھوں نے حضور شاہی میں عرضداشت کی
کہ جناب رشید میرے یہاں مجلس پڑھتے ہیں۔ شاہانہ عجب کرم نوازانہ ...
حکم ہوا کہ بدولت رونق افروز مجلس ہوں گے۔

بنا بریں دوسرے سال حضور نظام حسب وعدہ تشریف لائے اور مجلس حسینؑ کو زینت بخشی +

سادگی امامت اور شوکت دول

یہ اُس حسینؑ غریب کی مجلس عزا ہے جس میں شاہان اولوالعزم نے بارہا اپنی شان و شوکت ظاہری کو تھوڑی دیر کے لیے طاق نسیان کی نذر کر دیا ہے۔ اُس کربلا کے مسافر کی مصیبت کوئی معمولی مصیبت نہ تھی۔ گدا اور بادشاہ دونوں کے جذبات اِلم اس واقعہ جانگزا کے ذکر سے یکساں حرکت میں آتے ہیں۔ اور آخر کو منوا لیتے ہیں کہ اُس قتیلِ بے جرم کے مجبور شہزادہ نے اپنے بشیر و نذیر نانا کی اُمت کی مغفرت کے لیے دُنیا کی بڑی سے بڑی مصیبت کا سامنا نہایت خندہ پیشانی سے کیا کہ اُس کے عوض میں نہ صرف اسلام کسی ذی وقار فرمانروا کا بھی فخر ہے کہ اپنی دُنیاوی نگاہ میں آداب امامت کو ملحوظ رکھ کے تھوڑی دیر کے لیے اٹھا دیں عزت و احتشام کو اللہ کی مجلس سے لگے اور رسول اللہ کو خوش کرتے +

حضور نظام بے مسند اور حاضرین کے فرش پر تھے

حضور نظام کو اگرچہ مذہب شیعہ سے کوئی تعلق نہ تھا مگر جانتے تھے کہ یہ مجالس رسول اللہؐ کے نواسہ کا غم یاد دلانے کے لیے برپا کی جاتی ہیں۔ جن میں بیٹھنا اب بھی ایک وسیع اجر رکھتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ حضور والا جب نواب علی خاں بہادر کے یہاں مجلس میں تشریف لائے تھے۔ تو مسند تکیہ ہٹوا دیا تھا۔ اور اُسی فرش پر تشریف فرما ہوئے تھے جس پر عوام بیٹھے تھے +

نواب بہرام الدولہ بہادر کے یہاں بھی حضور والا کے لیے مسند تکیہ نہیں بچھایا گیا +

حضور نظام منبر سے کچھ فاصلہ پر دوزانو تشریف فرما ہوئے۔ زیادہ قابل ذکر یہ امر ہے کہ باوجود ایسی شدید گرمی کے کہ پسینہ میں تربتر ہو گئے تھے اپنے پنکھے کو رکوا دیا اور دوسرے شرکاء مجلس کو برابر پنکھا جھلا گیا +

جناب رشید کو بھی اپنا کلام پیشکش سمع ہمایوں کرنے کا یہ پہلا موقعہ تھا۔

آداب شاہی بجالا کر ممبر پر تشریف لے گئے اور یہ رباعیاں پڑھیں +

توصیف حیدرآباد	ماشاءاللہ ہے بہت خوب آباد	خوش وضع آباد ہے خوش اسلوب آباد
	حضرت کے قدم سے پائی ہے صورت شاد	حیدرآباد اب ہے محبوب آباد
	طالع جو بلندی پہ بتائے آئے	مہتاب کے ساتھ ماہ پارے آئے
	ہیں جلوہ فگن شاہ بھی شہزادے بھی	خورشید کے ہمراہ ستارے آئے

تیسرے مصرعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور عثمان علی خاں بالقابہ بھی بزمانۂ ولیعہدی اپنے والد ماجد کے ہمراہ تشریف لائے تھے + اس رباعی کے بعد ایک سلام پڑھا۔ اور مرثیہ شروع کر دیا مگر یہ لحاظ رہا کہ طول سخن حضور کی خاطر نازک پر بار نہ ہو۔ جا بجا عرض کرتے ہیں "حضور بس"، مگر حضور فرماتے ہیں "اور پڑھو" ہر شعر سے معلوم ہوتا تھا کہ رشید کا کلام جادو کا اثر کر رہا ہے اور کوئی دل نہ تھا کہ اثر نہ کرے۔ حضور نظام خود رو رہے تھے وہ حضور نواب مرزا خاں داغ مغفور کے کلام کو خاص حسن قبول عطا فرما چکے تھے۔ جو دہلی کے روز مرہ کی جان تھا۔ یہاں بھی مرثیہ کی یہی کیفیت تھی کہ گویا گلزار لکھنؤ کا ایک بلبل چہک رہا تھا نہ کہیں الفاظ ثقیل نہ کہیں مطالب دقیق۔ بندش سادہ الفاظ نرم و مناسب محل + یہی سبب باتیں تھیں جو حضور نظام کی شاہانہ آواز کو داد سخن کہہ کر بار بار بلند کرا دیتی تھیں۔ اور بیساختہ ... مشتاق و شیریں زبان ہر شعر پر جھک جھک کر آداب بجا لاتا تھا

مرثیہ اپنی پوری روانی دکھا رہا تھا ذاکر کا دل ہاتھوں سے جا رہا تھا۔ حتٰی کہ تقریباً دو گھنٹہ کی شرکت کے بعد حضور نظام رشید کو خلعت تحسین آفریں دے کر دولت سرا تشریف لے گئے۔ اور اس سال صرف ایک ہی مجلس میں شریک ہوئے۔ مگر دوسرے سال پانچ مجلسوں میں شرکت فرمائی۔ حضور نظام کی شرکت کی وجہ سے مجلس میں مجمع کی

کوئی انتہا نہ ہوتی تھی +

حضور نظام اپنا کلام رشید کو پڑھنے کے لئے عطا فرماتے ہیں

شب ۲۲ و ۲۳ ۱۳۳۰ھ میں حضور نے کئی مجلس میں شرکت نہیں فرمائی شب ۲۳ ... چودہ مجلسوں میں تشریف لاسکے اپنی بہت سی رباعیاں اور چار سلام رشید کو مرحمت فرمائیں اور ارشاد ہوا کہ آپ ایک یا دو رباعیاں اور ایک سلام روزانہ پہلے ممبر پر پڑھیے اور اس کے بعد مرثیہ شروع کیجیے۔ چنانچہ جناب رشید نے مطابق حکم عالی عمل کیا +

(مندرجہ رباعیاں اور سلام جناب رشید ایک مجلس میں پڑھتے تھے کہ نقل کرلی گئیں)

پہلے روز جب جناب رشید کو یہ رباعیاں اور سلام مرحمت ہوئے تھے تو انھوں نے پہلے اپنی یہ رباعی پڑھ کے اس کے بعد حضور نظام کی رباعیاں اور سلام پڑھا تھا وہ یہ

	رفعت سے پیام مجھ کو رفعت نے دیا کیوں ہو نہ رشید اپنی توقیر پہ ناز	رباعی	پیغام نظام مجھ کو عزت نے دیا پڑھنے کو سلام مجھ کو حضرت نے دیا	

ایک دوسری مجلس میں کلام فصاحت نظام کے پہلے رشید نے یہ رباعی پڑھی

	اعلیحضرت کو داد کیا دی جائے قرآن حق کا۔ یہ قول حق کا ہے کلام	رباعی	یہ نظم الٰہی نظر سے دیکھی جائے بعد اس کے تلاوت اس کی بھی کیجیے	

کئی رباعیاں حضور نظام نے ستائش رشید میں نظم فرمائی تھیں۔ اور پڑھنے کا حکم ہوا تھا۔ لہٰذا رشید نے جب ان کو پڑھا۔ ہر ایک کے جواب میں ایک رباعی مدح نظام میں پڑھی یہی لطف یہ ہے کہ رباعی میں رباعی کا جواب اور مدح نظام دونوں چیزیں موجود ہیں۔ مثلاً

(۱) آصف	مداح امام وہ جہاں میں ہے رشید پیری میں نیا رنگ سخن کا دیکھا		لاریب کہ اعجاز بیاں ہیں یہ رشید ہیں کیا کہوں واللہ جواں ہیں یہ رشید	

(۱) رسید (جواب)

پیری میں جوان بن کے دکھوں گا میں — اک جامہ نیا پہن کے دکھوں گا میں

حضرت نے جواں کہا سُنا تو نے فلک — ہر بار اب تجدد کو تن کے دکھوں گا میں

شاید دوسرا مصرعہ علاوہ دیگر محاسن کے خلعت کے حُسنِ طلب میں ہو۔ اسی سال حضور نے خلعت مرحمت فرمایا تھا۔ ذیل کی رباعی بھی اسی مضمون کی تائید کرتی ہے۔

رشید

ہر اک دم اضطراب ادھر آتا ہے — گرمی میں ماہتاب ادھر آتا ہے

سلطانِ دکن سے مانگتا ہے خلعت — جاڑے میں آفتاب ادھر آتا ہے

(۱) است

گو پیر ہیں پر طبع کی حدت دیکھو — ہر شعر میں ہر بات میں جدت دیکھو

کہتے ہیں یہ شعف سے مضامین رشید — پیری میں جوانی کی طبیعت دیکھو

(۱) رشید

حضرت کی یہ اعجاز بیانی دیکھی — پیری کی نہ ذرہ بھی نشانی دیکھی

آداب بجا لاتے ہی تھا رنگ کچھ اور — جُھک کر جو اُٹھا میں تو جوانی دیکھی

(۲) اصف

کیا خوب سخن ہم نے سُنایا ہے رشید — مضمون کا اک داغ لگایا ہے رشید

پیری میں یہ زور طبع ماشاءاللہ — کیا رنگ جوانی کا دکھایا ہے رشید

ممکن ہے کہ کسی مرثیہ کی بہار بہت پسند خاطر ہوئی ہو۔ اور اُس کی داد میں یہ رباعی ارشاد فرمائی ہو۔

(۳) رسید

قابو میں کبھی نہ لاسکے گی مجھ کو — ڈھونڈھے گی مگر نہ پاسکے گی مجھ کو

اعلحضرت نے سرفرازی بخشی — پیری اب کیا جھکا سکے گی مجھ کو

اس رباعی کی روانی اور تیور دیکھنے کے قابل ہیں جن طبیعتوں میں ذوقِ سخن خداداد ہے وہ اس کے مزے خوب لیں گے

ذیل کا سلام حضور نظام کے اُن سلاموں میں سے ہے جو رشید کو مرحمت ہوئے تھے۔

آصف - سلامی دیکھنا اشکوں کے گوہر ایسے ہوتے ہیں — سپے ہیں شہ نے دامن میں مقدر ایسے ہوتے ہیں

مضامینِ غمِ سرور ذرا دل تھام کر سنیے — رگِ جاں کھول دیتے ہیں نشتر ایسے ہوتے ہیں

سنا شبیر کا نام اور اک بجلی گری دل پر | جو دل میں درد رکھتے ہیں وہ مضطر ایسے ہوتے ہیں
فرشتوں نے کہا جب سر کٹاتے آپ کو دیکھا | ولی اللہ کے اللہ اکبر ایسے ہوتے ہیں
کٹے عباس کے لاشے پہ یوں شبیر کہتے ہیں | برادر پر مرے قرباں برادر ایسے ہوتے ہیں
لڑے اس ڈھنگ سے اکبر کہ دشمن بھی پکار اٹھے | بہادر ان کو کہتے ہیں بہادر ایسے ہوتے ہیں
زمیں سے عرش پر پہنچا دیا شبیر نے حر کو | خدا کے خاص بندے بندہ پرور ایسے ہوتے ہیں
غضب کا معرکہ تھا معرکہ عشق حقیقی کا | کیا سر آپ نے سر دے کے سر ایسے ہوتے ہیں
مرے آئینۂ دل میں ہے جلوہ ماہ زہرا کا | سکندر سے کہو دیکھے سکندر ایسے ہوتے ہیں
تن سرور پہ جتنے زخم تھے وہ سب بتاتے تھے | چھری تلوار برچھی تیر خنجر ایسے ہوتے ہیں
محبت زینب و شبیر کی دیکھو تو ظاہر ہے | کہ خواہر ایسی ہوتی ہے برادر ایسے ہوتے ہیں
لب و دندان شہ سے اور ہی کچھ بات پیدا ہے | نہ لعل اس رنگ کے دیکھے نہ گوہر ایسے ہوتے ہیں
لڑے بچے جو زینب کے تعجب اس پہ بیجا ہے | کہ جو شیروں میں پلتے ہیں وہ اکثر ایسے ہوتے ہیں
نہائے خون میں اصغر تو بانو نے کہا تھا یہ | کہ دیکھو باغ جنت کے گل تر ایسے ہوتے ہیں
عدو بھی رہ گئے حیراں جو دیکھا صبر حضرت کا | یہ کیا معلوم تھا سبط پیمبر ایسے ہوتے ہیں
جو تڑپے خون میں اکبر تو زینب نے کہا رو کر | کہ دریائے شہادت کے شناور ایسے ہوتے ہیں
مظالم کربلا کے سن کے حیرت اس پہ ہوتی ہے | کہ مٹی کے ہیں پتلے دل کے پتھر ایسے ہوتے ہیں
زمیں بولی فلک سے دیکھنا زہرا کے پیاروں کو | جو دن کو بھی چمکتے ہیں وہ اختر ایسے ہوتے ہیں
جو پوچھا تیغ قاتل نے کہ عاشق کیسے ہوتے ہیں | تو شہ بولے گلے اس کو لگا کر ایسے ہوتے ہیں
پھڑک کر شہ کی شہ رگ کہہ رہی تھی اپنے قاتل سے | کہ پیاسوں کے گلے مشتاق خنجر ایسے ہوتے ہیں
مزا کیا وصف سے ہیں دیدۂ تر اپنے اے آصف | یہ سمجھو آج جانا جام کوثر ایسے ہوتے ہیں

انعقاد مجالس مزید

اوپر ذکر ہو چکی ہے۔ مجلسیں نواب بہرام الدولہ بہادر کی مقررہ دس مجلسوں کے علاوہ حضور نظام کے حکم سے قائم کی گئی تھیں۔ ان مجالس کے برپا ہونے کا خاص سبب ظاہر ہے وہ یہ کہ رشید کے کمال نے حضور نظام کے اشتیاق کلام کو روز بروز ترقی دینی شروع کی۔ جس قدر زیادہ سنتے گئے اسی قدر زیادہ محظوظ ہوتے گئے جب دس مجلسوں سے شکم سیری نہ ہوئی تو نواب بہرام الدولہ بہادر کو حکم ہوا کہ پانچ مجلسیں اور کی جائیں۔ ما بدولت شرکت کریں گے۔ چنانچہ تعمیل حکم کی گئی۔ پانچویں مجلس میں پھر ارشاد فرمایا کہ اور چند مجالس ہوں۔ مجلسیں ہوتی گئیں اور رشید کے جوہر کھلنے لگے۔

جناب رشید کے یہاں روز ایک مجلس پڑھی گئی اور حضور نظام شرکت فرماتے رہے یہاں تک کہ جب تیرھویں مجلس کی نوبت پہنچی تو نواب بہرام الدولہ بہادر سے ارشاد ہوا "کہاں تک مجلسیں بڑھائی جائیں گی اب کل آخری مجلس ہے۔"

چودھویں مجلس میں حضور نظام جب تشریف لائے تو رشید کو اپنی ایک رباعی پڑھنے کو عنایت کی جو مضمون رخصت پر مشتمل ہے

آصف عشقِ شہِ دیں کا بیاں فرماتا ہوں — ہر روز مجالس میں جاتا ہوں آتا ہوں
منظور الٰہی ہے تو پھر آؤں گا — یا حافظ و ناصر میں کہے جاتا ہوں

جناب رشید کی برق مثال فکر نے بھی فوراً ذیل کی رباعی اسی ردیف و قافیہ میں موزوں کی اور اس کے بعد پڑھی۔

رشید پیری سے ضعف گو بہت پاتا ہوں — پھر فصلِ عزا آئے کہ پھر آتا ہوں
حافظ ہے وہ حضرت کو اسی سے لو لگا — میں جس کی حفاظت میں دیے جاتا ہوں

اب مجلسیں ختم ہوئیں اور جناب رشید رقم مقررہ کے عطیۂ خزانۂ شاہی سے بھی بہرہ یاب

ہوئے + تعجب ہوتا ہے کہ مابین حضور نظام و رشید تعلقات سخن گوئی اس حد تک پہنچ چکے تھے اور مراحمِ خسروانہ کی ابتدا ہو چکی تھی۔ مگر پھر بھی رشید کی قسمت نے کوتاہی کی۔ کہ نسلاً بعد نسلٍ کوئی انتظام فارغ البالی نہوا۔ ہاں۔ ایک سال قبل انتقال اعلیٰحضرت نے رشید سے فرمایا تھا "آپ کے لیے انشاءاللہ میں کچھ سامان کر دوں گا" مگر افسوس ہے کہ رشید کی قسمت نے یاوری نہ کی۔ یعنی آنجہانی حضور نظام کی زندگی نے وفا نہ کی +

سفرِ ملک | جناب رشید کو اُن کا کمال اور ضرورت ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں لیے لیے پھری۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں نواب نصیر الممالک مرزا شجاعت علی خاں بہادر عارف کے یہاں تشریف لے گیے۔ اول دو تین سال تک نواب صاحب موصوف و جناب رشید سے سلسلۂ خط و کتابت جاری رہا۔ اسی اثنا میں حکیم صادق حسین صاحب خلف حکیم حیدر حسین صاحب سے اس معاملہ میں گفتگو رہی۔ مگر رشید کی خودداری نے اُن کو اجازت نہ دی۔ مایحتاج سے کچھ زیادہ اُن کو حیدرآباد سے مل جاتا تھا۔ پھر کیا ضرورت تھی کہ ہوس مزید سے اپنے دامنِ کمال کو آلودہ کرتے۔ چونکہ جناب نواب صاحب خود وسیع النظر اور کمال شناس افراد میں سے ہیں۔ اس وجہ سے جب جنابِ رشید نے معمولی تحریک سے اُن کے یہاں جانے سے پہلو تہی کی تو نواب صاحب نے بھی یہ مرحلہ وقتِ ملاقات تک ملتوی رکھا۔ چنانچہ جب غالباً سنہ ۱۹۱۰ء میں اجلاس شیعہ کانفرنس کی شرکت کے لیے جو لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا۔ تشریف لائے تو جنابِ رشید سے ملنے گئے فرمایا "میں اب آپ سے زبانی وعدہ لیتا ہوں" رشید نے وعدہ کر لیا۔ اور اسی سال سے ماہ ربیع الاول میں تشریف لے جانے لگے +

کلکتہ میں مجلسیں پہلی ربیع الاول سے شروع ہوتی تھیں۔ اور دس کو ختم ہوتی تھیں۔ جناب رشید آٹھ روز قیام فرماتے تھے۔ خواجہ عشرت نے لکھا ہے کہ عشرہ پڑھتے ہیں مگر نہیں۔ جناب رشید نے ایک مجلس پہلی سال جناب نواب صاحب کی کوٹھی میں پڑھی جو کلکتہ میں ہے اور سفارت خانہ کے نام سے موسوم ہے۔ اس کے بعد سے سفارت خانہ میں دو مجلسیں پڑھا کرتے تھے۔ اور ایک مجلس امام باڑہ فردوس محل واقع ٹٹیا برج میں اور بس۔ جناب نواب صاحب رشید کو تین سو پچاس روپیہ مرحمت فرماتے تھے +

جناب رشید حالانکہ برابر حیدرآباد اور کلکتہ جاتے رہے۔ مگر یہ بات حیرت انگیز ہے۔ کہ نہ تو انھوں نے خاص طور سے حیدرآباد کی سیر کی نہ کلکتہ کی۔ لوگوں نے اکثر کہا بھی مگر جواب دیا "میں ضعیف ہوا سیر و تفریح تو جوانوں کو زیبا ہے"

خدائے سخن میر علیہ الرحمہ کا بھی ایک واقعہ "آب حیات" میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ اُن کو لکھنؤ کے ایک مرتبہ شناس نواب اُن کی تکلیف دیکھ کر مع اہل و عیال اپنے مکان لے گئے اور محل سرا کے پاس ایک معقول مکان رہنے کو دیا۔ نشست کے کمرہ کی کھڑکیوں کا رُخ باغ کی طرف تھا۔ میر صاحب جب وہاں تشریف لے گئے تو کھڑکیاں بند پڑی تھیں اور اُسی طرح کئی برس اُن کی موجودگی میں بھی بند پڑی رہیں اُن کو کھول کر کبھی باغ کی طرف نہ دیکھا ایک دن کوئی دوست آئے انھوں نے کہا کہ اُدھر باغ ہے آپ کھڑکیاں کھول کر کیوں نہیں بیٹھتے۔ میر صاحب بولے۔ کیا اُدھر باغ بھی ہے۔ انھوں نے کہا۔ اسی لیے نواب صاحب آپ کو یہاں لائے تھے کہ آپ کا جی بہلتا رہے اور دل شگفتہ ہو۔ میر صاحب کے سامنے پھٹے پرانے مسودے غزلوں کے پڑے تھے اُن کی طرف اشارہ کر کے کہا "میں تو اس باغ کی فکر میں ایسا لگا ہوں کہ اُس باغ کی خبر ہی نہیں" +

مرزا غالب اور کلکتے کے نظر فریب مناظر

فطرتی مناظر کا حظ یورپ کے شعرا نے جلیبا اُٹھایا ہے مشرقی حصّوں کے شعرا نے ویسا نہیں اُٹھایا اور اگر اُس سے فائدہ اُٹھایا بھی تو ایسے ہی شعرا نے جن میں فطرت نے نظارے سے اثر لینے کی قوت پیدا کر دی تھی +

جس کلکتے کی سیر رشید نے نہیں کی اُسی کلکتے کو ہمارا ذکی الحس مست خیال شاعر غالب دہلی میں بیٹھا ہوا یوں یاد کرتا ہے +

قطعہ

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں	اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب	وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ اُن کی نگاہیں کہ حف نظر	طاقت ربا وہ اُن کا اشارا کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ واہ	وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

وہاں کی مغربی طرز کی آبادی - جا بجا پائیں باغ - ولائتی جگر اور اُس کی سر شام انجمن سازی حسینانِ پارسی و فرنگ کی آزاد ہوا خوری - ان سب کے اثر سے غالب ایسا دل و نظر رکھنے والا کہاں تک بچتا + بالآخر کسی موقت کیف شراب میں گنگنا اُٹھا - کہ ع

وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

حقیقت تو یہ ہے کہ مصرعہ آخر کا تابع تمام قطعہ ہے - پرتگال و فرانس سے چلی ہوئی پہلے مدراس بمبئی - کلکتے کے بندرگاہوں پر کھلتی ہے اور وہاں کے قدح نوشوں میں تازے دَور چلتے ہیں +

رشید کو اُس سے کیا علاقہ تھا - اُن کے دماغ کو تو مینا نہ جنت - ساقی نجف ساغر کوثر - حورانِ خوش منظر سب کے سب اپنی طرف اس قدر متوجہ رکھتے تھے کہ اگر ایک دفعہ

جنت شدّاد کا سماں بھی سامنے سے گذر جاتا تو اُن کا خیال نہ بہکتا۔ چنانچہ ایک مرتبہ میں نجف سے مخاطب ہو کے کہتے ہیں +

مئے بخشش سے بھلا کب مجھے مایوسی ہے — جس سے ملتا ہے خدا تیری محبت وہ شئے
نشہ بڑھتا ہے اُسی کا ہوں میں ہمدم دیدے — مئے اُلفت کے تصور میں سراپا ہو کے

کب میں ناکام رہا رونے کا کام بنا
دل اگر بیٹھ گیا ذرّۂ تہ جام بنا

کلکتہ میں بھی جناب رشید کے احباب ایسے ہی کمال شناس اور قدر داں تھے جیسے حیدر آباد وغیرہ میں۔ مگر ان سبھوں میں جناب سید ناصر صاحب شوستری رئیس کلکتہ کو جناب رشید سے بے حد حسنِ عقیدت تھا۔ جب جناب رشید کلکتہ پہنچتے تھے حتی الوسع سید صاحب موصوف سے جلد سے جلد ملنے کی کوشش کرتے تھے +

ایک مرتبہ جناب رشید سید صاحب سے ملنے گئے۔ اثنائے گفتگو میں چاء اور الائچیوں کا ذکر آگیا۔ کسی صاحب نے کہا ”بروک بونڈ“ اچھی ہوتی ہے۔ کوئی بولا لپٹن کم خرچ بالا نشیں ہے۔ غرضکہ حاضرین نے اپنی مختلف رایوں کا اظہار کیا۔ اب جناب رشید کی باری آئی تو فرمایا ”جو زیادہ رنگین ہو وہی عمدہ“۔ سید صاحب چونکہ حسنِ عقیدت رکھتے تھے سمجھے کہ رشید کو چاء اور الائچیاں مرغوب ہیں۔ لہذا جب رشید لکھنؤ واپس آئے تو چند دنوں کے بعد سید صاحب نے الائچیاں اور چاء تحفۃً رشید کو روانہ کیں۔ رشید نے تین رباعیاں بطور شکریہ لکھ بھیجیں اور وہ یہ ہیں

شکریہ حصول تحفہ

ناچیز کو بھیجا تھا جو تحفہ پہنچا — گردوں سے زمیں پہ من و سلویٰ پہنچا
بس اس کا عوض یہ ہے دعا دوں میں رشید — مجھ کو مرے دوست کا عطیہ پہنچا

الائچیوں کا شکریہ	جو دانہ ہے مشک کی طرح بے شک ہے ہر ایک الائچی ہے ایسا غنچہ		تخم الفت سمجھ لے گر زیرک ہے جس کی خوشبو دماغ سے دل تک ہے	
چاء کا شکریہ	آپ کے پیش کش کو تیار رہوں میں اس چاء میں کیف ہے مئے الفت کا		صدقے میری جو ہو تو ناچار ہوں میں ساقی سید حسین میخوار رہوں میں	

پہلی اور تیسری رباعی بالکل صاف ہیں۔ مگر دوسری رباعی بہت خوب کہی ہے الائچی کے دانہ کا تخم الفت سے ایسا استعارہ کیا ہے کہ سبحان اللہ۔ اور پھر زیرک بھی بہت خوب ہے۔

رشید کا دورہ سلیم پور میں

جب جناب رشید نے لکھنؤ میں ترک مرثیہ خوانی کا اعلان کر دیا تو ان کے کلام کے پیچھے دلدادہ شکستہ خاطر ہوئے۔ اور دعائیں مانگتے تھے کہ رشید کسی طرح پڑھیں اور وہ سنیں۔ جب انھوں نے دیکھا کہ ہر قسم کی کوشش جناب رشید کے لکھنؤ میں پڑھنے کے لیے ناکامیاب ہے۔ تو یہ عزم کیا کہ اگر رشید لکھنؤ کے اطراف میں بھی پڑھینگے تو سننے جائیں گے چنانچہ ایک شخص میر کاظم حسین صاحب نے کوشش کی اور وعدہ لیا۔ کہ وہ ماہ صفر میں ایک مجلس کانپور میں پڑھیں۔ چنانچہ رشید حسب وعدہ ہر سال وہاں گئے۔ مجلس بڑے امام باڑہ واقع محلہ پٹکاپور میں ہوتی تھی علاوہ اطراف کے مومنین کے لکھنؤ سے تقریباً دو ڈھائی سو آدمی جایا کرتے تھے۔ اور مجلس ایک بڑے مجمع سے ہوتی تھی +

جناب راجہ صاحب سلیم پور کے یہاں بھی ایک مجلس اسی زمانہ میں پڑھتے تھے روز مجلس صبح کو راجہ صاحب کا موٹر آجاتا تھا رشید چلے جاتے تھے۔ اور بعد ختم مجلس واپس آتے تھے راجہ صاحب ایک معقول رقم دیتے تھے +

ایک مرتبہ سنہ ۱۹۱۶ء میں جناب خان بہادر سید محمد ہادی صاحب آدی ڈپٹی کمشنر پنشنر جناب رشید کی ملاقات کے لیے رکاب گنج تشریف لائے۔ سید صاحب موصوف نے

چند رباعیاں جناب رشید مغفور کو سنائیں۔ بہت خوش ہوئے۔ تحسین کلام ان الفاظ میں فرمائی: "آپ کا رنگ سخن بالکل نیا ہے۔ اور زبان بھی بہت خوب ہے"۔ جناب سید صاحب جعفر منزل (قیصر باغ) میں مقیم تھے۔ دوسرے روز جناب رشید بازدید کی غرض سے تشریف لائے۔ جناب سید صاحب نے چاہا کہ وہ ایک مجلس لکھنؤ میں منعقد کریں اور جناب رشید رونق افروز منبر ہوں۔ مگر چونکہ جناب رشید نے لکھنؤ میں مرثیہ پڑھنا ترک کر دیا تھا۔ اس سبب سے تامل ہوئی۔ جناب سید صاحب نے اپنے دولت خانہ پر (سلطان پور میں) ایک مجلس کرنے کا ارادہ ظاہر کیا اور جناب رشید سے وعدہ لیا مگر یہ مجلس بوجہ علالت جناب سید صاحب موصوف ملتوی ہو گئی اور جناب رشید راہیِ ملکِ عدم ہو گئے۔ چند رباعیاں جو جناب ہادی صاحب نے جناب رشید مغفور کو سنائی تھیں اور از راہ کرم مجھ کو عنایت فرمائی ہیں۔ ذیل میں درج کرتا ہوں۔

رباعیات

ہادی تو اور کسی خطا سے نہ ڈرے
اس نازش حسن مرتضیٰ سے ڈریے
حسرت ہے گنہگار سے اس سے نہ ڈرے
ایسا تو ہو کہ پھر خدا سے نہ ڈرے

کیونکر کوئی اُمتی سزا سے نہ ڈرے
یہ دو تو خدا سے ہیں ڈرانے والے
مومن کیسا اگر علیؑ سے نہ ڈرے
جو ان سے ڈرے وہ پھر کسی سے نہ ڈرے

دُنیا کی ہوس ہے دین کی بربادی واہ
رونے سے نمائش کا نگاہ ہے
تو اور یہ راہ واہ اے ہادی واہ
مولا کا غلام اور آزادی واہ

سرمست ولا نبی کی صحبت والے
بوذر مقداد ابن یاسر سلمان
تھے رند کئی بڑی محبت والے
اس بزم کے پہنچے ہوئے متوالے

ہادی یہ نصیریوں کی ملت والے
لیکن اُن کا مذاق تھا غیر سلیم

سمجھے رندا سی نشۂ الفت والے
اتنی پی لی کہ ہو گئے متوالے

موتی سے گئے وہ دانت پہنا کیا
ہادی بنوا کے دانت کیا کام بنا

اب لہجۂ و لب ہیں وہ سناتو کہاں
گویا نکلی ہے یہ وہ بات کہاں

تلامذۂ جناب رشید

یوں تو جناب رشید کے شاگردوں کی اگر فہرست لکھی جائے تو طویل ہوگی مگر یہ چند حضرات قابل ذکر ہیں۔

نواب تراب علی خاں صاحب سعید۔ نواب جان خاں بہادر۔ جناب سید باقر صاحب حمید۔ جدید سید عسکری مرزا صاحب موجب۔ سجاد حسین صاحب سدید۔ مہدی حسن صاحب ناصری پروفیسر۔ احمد حسین عرف منو صاحب شفیق (صاحب دیوان) ابو صاحب علیں۔ حقیر مؤلف۔ نواب بڈھن صاحب قمر۔ سید مہدی حسین صاحب مہدی۔ سید انور حسین صاحب انور۔ احمد خاں صاحب انظم منشی حامد حسین صاحب حامد +

واقعات آخر عمر

جیسا اوپر بیان ہوا۔ رشید نے لکھنؤ میں مرثیہ پڑھنا ترک کر دیا تھا۔ قاعدہ ہے کہ جب کسی فن کے کرنے والے اپنی زندگی کے آخری کنارہ پر پہنچنے لگتے ہیں۔ تو زمانہ دوسرے افراد اُن کی قائم مقامی کے لیے تیار کرنے کا عمل شروع کر دیتا ہے چنانچہ رشید۔ عارف اوج۔ جاوید کے بعد مرثیہ گوئی کے قیام کے لیے چند نو خیز خاندانی مرثیہ گو میدان امتحان میں خم ٹھونک کر آ کھڑے ہوئے اور یہاں وکل شیء یا بذل لدیہ۔ عوام نے بھی اُن کی طرف غیر معمولی دلچسپیوں کا اظہار کیا۔ اور جانبداری میں اس قدر افراط و تفریط سے کام لیا کہ پرانے افسوس گوشہ گیر ہو گئے۔ اگر مرثیہ گوئی اُن کا ذریعہ معاش نہ ہوتا تو غالباً سب کے سب گوشہ گیر ہو گئے ہوتے۔ اور پھر کوئی اُن کی صورت نہ دیکھتا۔ کنج عزلت و قناعت

کی لذت جن کو حاصل ہو وہ اسے ایک نعمتِ عظیم سمجھتے ہیں۔ ہر وقت میں رشید اس نعمت سے بہرہ ور ہوئے اور نہایت خوبی سے نبایا +

جناب رشید نے اپنے کلام میں پیری کو اس درد آواز میں دکھایا کہ وہ اُن کے پاس عین وقت پر آپہنچی تھی۔ اعضا جواب دے چکے تھے۔ جب کوئی ملنے جاتا تھا تو فرماتے تھے "ہم تھک رہے ہیں اور ناتوانی بڑھ رہی ہے" جن لوگوں نے اُن کو قوی و تندرست دیکھا تھا۔ یہ حالت دیکھ کر اکثر آبدیدہ ہو جاتے تھے +

صورت یہ تھی کہ چھیاسی برس کا سن۔ وہ کمر جس میں کبھی تلوار بندھتی تھی پیرانہ سالی سے جھکی ہوئی وہ آنکھیں جنھوں نے ایک عمر دنیا کی مختلف نمائشوں کی سیر کی ضعف پیری کی شاکی وہ ہاتھ جنھوں نے زلفِ پریشانِ سخن آراستہ کی ضعف سے مرتعش۔ وہ سر جس کے مختلف گوشے کبھی شاعرانہ نازک خیالیوں سے مملو تھے معمولی مسافت سے بیکار۔ وہ زبان جو زبانِ انیس کی ترجمان تھی دنیائے سخن کی ناگوار شورش سے خاموش۔ مگر رشید اب بھی وہی رشید تھے۔ اگر کوئی وقتِ آزمائش آپڑتا تو اُن کی قوتِ شاعرانہ اسی طرح کام کرتی جیسے تیس برس قبل +

چنانچہ ایک مرتبہ مکان سے اپنے چھوٹے بھائی جناب کلن صاحب کے یہاں جا رہے تھے۔ مسافت سو قدم سے زیادہ نہ ہوگی کہ لڑکھڑا کر گر پڑے۔ اتفاق سے اُسی وقت کچھ حضرات ملنے آرہے تھے انھوں نے جلدی سے اٹھایا۔ رشید نے فوراً شکایتِ ضعف میں یہ شعر پڑھا ؎

ضعف نے اوج بڑھایا ہے یہ قبالی کا
پاؤں کرتے ہیں ارادہ سری پامالی کا

اس واقعہ کے بیس روز سے آپ صاحب فراش ہوئے کہ پھر نہ اٹھے +

وفات رشید | اس سے پہلے لکھ چکا ہوں کہ رشید بہت کمزور ہو گئے تھے۔ ان کی گفتگو سے مترشح ہوتا تھا کہ موت کا شدید انتظار کر رہے ہیں۔ جو جانتے تھے کہ اس ایسی بیماری کا نتیجہ ہوگا۔ سمجھتے تھے کہ کچھ نہ کچھ اثر ہونا تھا۔ کہ یکایک شب پنجشنبہ چودہ ذیقعدہ ۱۳۲۳ ہجری کو شرف الاطبا پر فالج گرنے کی خبر دی کہ کہاں اب دنیا پر رشید کا احسان ختم ہوتا ہے۔ زبان انکی خاموش ہوتی ہے۔ وہ وجود جو پرانے وضع و اطوار کا آخری نمونہ تھا۔ راہ فنا طے کرکے ملک بقا آباد کرنے والا ہے۔ صبح ہوتے ہوتے رشید کی علالت کی خبر تمام شہر میں مشتہر ہوگئی۔ اعزا و احباب اس وجود مغتنم کی عیادت کو جوق جوق آنے لگے + رشید بجز حرکت لب کے ادائے شکریے کا زبان کو یارا نہ تھا۔ جو شخص سامنے آتا تھا سلام کو پہلے ہاتھ اٹھا دیتے تھے۔ روز علالت سے چودہ دن تک اسی حالت میں رہے۔ شہر کے نامور اطبا مثلاً جناب حکیم منے آغا صاحب فاضل۔ جناب حکیم سید مظفر حسین صاحب طبیب جناب حکیم سید ... صاحب مرحوم جناب حکیم مظفر حسین صاحب وغیرہم پاس رہ کر مصروف تدبیر تھے لیکن موت کا کیا علاج۔ آخر کار چوہتر برس کی عمر کے بعد بروز چہارشنبہ ۲۷ ذیقعدہ ۱۳۲۳ ہجری وقت سحر اس دنیائے فانی کو خیرباد کہہ کے ملک بقا میں روحانی زندگی کی ابتدا کی۔ اعزا و احباب کو اپنی یاد کا غم دے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

صبح کو ہزاروں آدمیوں سے میر عشق کی بغیہ بھری ہوئی تھی۔ لکھنؤ کے ہر طبقے کے لوگ شرکت تجہیز و تکفین کا آخری احسان رشید کی روح پر کرنے کو

بیٹھے تھے کہ نماز میت کے لیے صفیں مرتب ہوئیں۔ رشید کے محترم دوست
جناب مولوی محمد سید حسین صاحب علامۂ ہندی مرحوم نے نماز میت پڑھائی۔
چاروں طرف سے آواز بکا بلند تھی۔ لکھنؤ کی وحشت ناک حزن شرافت اور جوہر
کمال سے خمیر ہوئی تھی جس کی ہیروں میں نہاں ہونے والی تھی۔ اعزا الگ گریاں تھے
احباب الگ خروشاں۔ علما الگ آبدیدہ۔ چنانچہ افقہ زماں مولانا سید باقر صاحب
قبلہ مجتہد العصر نے جناب حمید مرحوم سے درد آمیز لہجہ میں فرمایا: "آج ہم میں سے
ایک صاحب کمال کم ہو گیا۔" اُن کے علاوہ اور دوسرے مجتہدین اولوالعزم مثلاً
شمس العلما جناب مولانا سید ناصر حسین صاحب قبلہ۔ شمس العلما جناب مولانا سید
نجم الحسن صاحب قبلہ۔ زبدۃ العلما جناب سید آقا حسن صاحب قبلہ۔ جناب مولانا
سید سبط حسن صاحب قبلہ۔ جناب مولانا سید محمد رضا صاحب قبلہ مرحوم اعزا کو
تلقین صبر فرما رہے تھے +

چونکہ امام باڑہ کے اُس حجرہ میں جہاں تعشق و صابر وغیرہم مدفون ہیں
بالکل جگہ نہ تھی۔ اس لیے اُس دالان میں جو زیر مسجد ہے مدفون ہوئے + جمعہ کو مجلس
فاتحہ خوانی ہوئی۔ اور بائیس ذی الحجہ بروز یکشنبہ امام باڑہ جناب سید تقی صاحب
اعلی اللہ مقامہ میں مجلس چہلم ہوئی۔ اور متعدد قطعات تاریخ پڑھے گئے۔ جن میں سے
اختصاراً چند درج کیے جاتے ہیں +

منظومہ مداح آل محمد جناب مرزا کاظم حسین صاحب محشر لکھنوی

ہزار حیف جہاں سے اُٹھے جناب رشید	ریاض مدح میں اک حشر ہو گیا برپا

زبانِ اہلِ سخن پہ یہ نوحۂ غم ہے — اٹھیں کہاں وہ جو تھا کمال فن و ادا

گئے عدم کو جو وہ زیبِ بزمِ مجلس — جناں میں پائی جگہ نزد سید الشہدا

نکاتِ نظم پہ قادر طبیعتِ فطری — زباں سے شعر جو نکلا وہ دل پہ ۱۴۳

رباعیات میں بہر طرح یوں سکھائی ہو — جو ان کے بعد اب وہ طرز کہہ گئے کوئی

بہارِ مرثیوں کی وہ بہارِ گلشن تھی — کہ جس پہ بلبلِ سدرہ بھی والہ و شیدا

زباں وہ صاف کہ مانندِ موجِ کوثر — مزا تھا بزم میں جب سے علی کی مدح کا

سنوارتے تھے شوق سے جو بیاں ہزاروں — خود آئی قدرتِ تخییل بن کے آئینہ

دکھائی بزم میں ... قدرتِ بیانی — دلِ عدو بھی تھا حسنِ قبول کا شیدا

رشید تھے ... اہلِ سخن — کلامِ حسن کا سند اہلِ علم نے مانا

مریض ہو گئے اور دفعتاً ... — محال ہو گیا بارِ حیات کا اٹھانا

محالِ صحت سے عالم کو ... — مگر گئے سوئے لحد جبکہ آئی قضا

سحر کا وقت تھا ... — کہ آفتابِ کمالات زیرِ خاک چھپا

... احباب ہاتھ سے کیسے — ہر ایک آنکھ سے جاری تھا اشکوں کا دریا

وہیں پہ قبر بنی جس جگہ پہ سوتے تھے — بس ایک ہی تھا حیات و وفات کا نقشہ

شمیمِ قبر سے پھولوں کی دیتی تھی خبر — وہ پہنچا ... سوئے جنت الماوا

سنِ وفات یہ شعر سے کہہ اٹھا رضوان — ہر ایک بیت پہ اک گھر ارم میں ملا

منظومہ جناب سید ظہور حسین صاحب فروغ سیتاپوری

ہاے گرا ماتم پہ در و رشید بکیست — رفت زیں وادیٔ بکا کامل و اعجاز بیاں
۱۹۱۸ء — ۱۳۳۶

والے ... صعب فروغ — واقفِ فنِ سخن حیف نماندہ بجہاں
۱۹۶۵ — ۱۳۳۶ھ

دوسرا سانحہ جانگزا
انتقال حمید۔

جناب سید محمد رشید مرحوم کے بعد اس خاندان میں لوگوں کی نظریں اُن کے
بھائی جناب میر باقر مرزا صاحب حمید پر پڑنے لگیں یہ مرحوم بھی
نہایت کہنہ مشق اور خوش گو تھے۔ دبیرانہ مرثیہ گوئی میں لوگ ان کو بھی نظر تحسین سے
دیکھتے تھے۔ خصوصاً بعد وفات جناب رشید۔ مگر افسوس ہے کہ عالم پیری آ پہنچا تھا
۱۴ ماہ صفر [illegible] کو جناب حمید نے بھی بعارضہ تپ وبائی مبتلا ہو کر انتقال کیا۔ جناب حمید
میں وہی پرانی وضع کے جوہر پائے جاتے تھے۔ اخلاق نہایت وسیع تھے۔ گفتگو نہایت نرم
اور شیریں تھی۔ اعزا و احباب سے ہمدردی کرتے تھے۔

اسی سال جناب نواب بہرام الدولہ بہادر نے انھیں حیدرآباد طلب فرمایا تھا۔
اور جناب رشید جن تاریخوں میں مجلسیں پڑھتے تھے اُن میں پڑھوایا تھا مشہور ہے کہ
حمید مغفور نے بھی جناب رشید کی طرح مقبولیت حاصل کی تھی۔ بعد ختم مجالس
وہیں تپ میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اسی حالت میں لکھنؤ واپس آئے اور چند روز کے بعد
انتقال کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اب رشید کے نواسے جناب میر سجاد حسین صاحب شدید بحمد اللہ موجود
ہیں۔ جن سے اُن مرحوم کا نام روشن ہو سکتا ہے۔

فرنگی محل یا لکھنؤ

یونانی دواخانہ

حضرات یہ دواخانہ تین سال سے پبلک کی خدمت کامیابی کیساتھ بجالا رہا ہے۔ بفضل خدا ہر قسم کی مفرد و مرکب دوائیں نہایت اہتمام کے ساتھ بہم پہونچائی جاتی ہیں تاکہ خریداروں کو کوئی شکایت کا موقع نہو آج تک حکیم صاحب بھی اس دواخانہ کے خریدار ہیں انکو دوسرے دواخانہ کی بنی ہوئی دواؤں نے خاطر خواہ اثر کیا حکیم نیا صاحب کے کل مجربات تیار رہتے ہیں اور قیمت اسکی کم ہے کہ ہر امیر و غریب انکا استعمال کر سکتا ہے اور فائدہ اٹھا سکتا ہے نسخے یہاں تیاری کیلئے دیے جاتے ہیں انکا انتظام مالک دواخانہ اپنی نگرانی میں کرتے ہیں تاکہ خریدار اطمینان ہو عرق اور شربت میں اس کارخانہ کو خاص امتیاز ہے۔ اگر دس قسم کے شربت ایک ایک شیشی میں رکھ دیے جائیں تو دسوں شربت نہیں دیکھنے والے کو الگ ہو جائے۔ یہ خصوصیت دوسرے دواخانوں کو میسر نہیں ہو سکتی۔

اس قسم کے دواخانے بہت سے کھلے اور ٹوٹ گئے مگر بحمد اللہ یہ دواخانہ اپنی پہلی سی آب و تاب کے ساتھ قائم ہے تمام حکما اپنے اپنے خاص خاص نسخے خصوصیت کے ساتھ نہیں دیتے ہیں تاکہ انھیں اپنے علاج کے اثرات کا کافی اندازہ ہو۔ دوا کی برائی کا شک دل میں پیدا نہ ہو

اگر کسی صاحب کو اس قسم کی ضرورت ہو تو ضرور اس کارخانہ کی آزمائش کریں انشاء اللہ انکو کوئی شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔

نوٹ۔ فرمائش نہایت صاف اور خوشخط لکھیے اور چوتھائی قیمت پیشگی روانہ فرمائیے۔

سردار حسین منیجر دواخانہ یونانی پل فرنگی محل لکھنؤ

ہندوستانی بدن میں تازہ روح

[illegible] ہندوستانی و شائقان علاج طب اسلامی کو [illegible] لکھنؤ میں [illegible]
[illegible] دواخانہ معدن الادویہ [illegible] الحاج حکیم [illegible]
[illegible] فائدہ اٹھایا [illegible]
اس دواخانہ [illegible] ادویات [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] امراض [illegible] علاج [illegible]
[illegible]
[illegible] دواخانہ [illegible]
[illegible] امراض کا علاج کرا [illegible] سکیں گے۔

طبی مشورہ مفت

دواخانہ [illegible] ہر قسم کے مرض کا طبی مشورہ مفت [illegible]
[illegible] زیادہ احتیاط [illegible]
[illegible] جوابی ٹکٹ ضرور آنا چاہئے۔

(فہرست دواخانہ مفت طلب کیجئے)

المشتہر

منیجر دواخانہ معدن الادویہ وکٹوریہ اسٹریٹ (لکھنؤ)